

اُم طیفور

پیاسا ملن کی رت



نہیں اترتا تھا اور شور بہ ارد گرد کی چیزوں کو بھی نوش
 کر دیتا جاتا تھا۔ کبھی گود میں کشن بچا لیا تو کبھی ہاتھ
 چھلک گیا تو کابٹ کا پی خوش کر دیا۔ اچار کے تو خیر کیا
 کھنہ! سوڑے میاں لڑھک لڑھک جاتے تھے۔
 اور ہم کی پھانسیں تو چوس چوس کر چٹکی میں اڑا دی
 جاتیں۔ واللہ! کالم والی ماسی سڑ گلیاں دیتی تھی
 جب بھی وہ بڑے کمرے کی صفائی کرتی۔ ٹیل میٹ کو
 دیکھ کر تو خیال ہی پوچھے کا آتا تھا۔ چکنائی سے اٹا اور
 اچار میں بساوا ٹیل میٹ کپڑے دھونے کے پاؤڈر کے
 استہار میں غرق کیے جانے والے ٹیل میٹ جیسا ہی
 ہوتا تھا۔ صبح صبح کمر کی فضا میں خوب ہلکا کار پی ہوتی
 تھی۔ کمر کے چھوٹے بڑے تمام افراد کی زبان اردو اور
 پنجابی کا ملغوبہ تھی۔ مائیں گلابی اردو میں بچوں کو
 قدرے مذہب انداز میں پکارتیں جبکہ سہیلیاں ذرا یہ
 نمونہ ملاحظہ کیجئے!
 ”میرا موزہ کتھے اے۔“ بچہ اپنی ماں سے استفسار
 کرتا۔
 ”ماں صدقہ۔! بیڈ کے تھلے (نیچے) کیوں۔“

چار کنل کی وسیع و عریض کوٹھی میں طنز چڑھ چکا
 تھا۔ ایسی بھارت بھارت کی کوازیں آ رہی تھیں کہ
 اللہ کی پٹلی! ابھی محض صبح کے چھ بجے تھے مگر
 یہاں جیسے دو سرے پر کا سے تھا۔ ناشتا بن رہا تھا اور
 چھپا چھپ بورچی خانے سے رائے چھپ کر آرہے
 تھے۔! جی ہاں! یہاں رائے چھپتے ہی تھے کیونکہ
 افراد خانہ زیادہ تھے۔ لہذا صبح صبح بڑوٹک اور
 افراد نفری میں خواتین جلدی جلدی پرائیوٹوں کے نام پر
 آڑے ترے سے نمونے کو تو بے بے تمنا اٹھانے لے
 دیکر کئی پردے مارتی تھیں۔ چھپ چھپ چھپ
 بچے کھی کی زیادتی کو نوٹس میں رکھتے تھے بیلوٹ کو
 نہیں بھنڈا خوش دلی سے کھا لیتے تھے!
 مگر کمر کے مردوں کے ساتھ وہ سراسملہ تھا۔ ان کو
 بول بڑھایا نہیں جاسکتا تھا۔ اس لیے بچوں کو ناسخ کر
 کے کمر کے مردوں کو ذرا اہتمام سے ناشتا کروایا جاتا۔
 یہ اور بات کہ ناشتا کھا اہتمام سے جاتا مگر اس کے بعد
 ہلا بول دیا جاتا تھا۔ پرائیوٹوں کو شور بولے سالن کے
 ساتھ نوش کیا جاتا تھا کہ خشک سالن گلے سے نیچے

مکمل ٹافل



”دو تھے کھ (مٹی) جی ہوئی اسے۔“ بچہ بیڈ کے نیچے جھانک کر ہانک لگا۔

”لب لے اوتھے ای ہون تیری جراب دے پیچھے اپنا آئندہ ساڑواں۔“ مٹی کا پتہ نہ اردو بس اتنا ہی ہوا جو آخر کار چھلک جانا اور وہ اپنی اوقات میں تشریف لے آئیں۔ بچہ صاحب تھک بار کو بیٹھا غارم کے نیچے رکھیں جرابیں چڑھالیتے اور پھر مٹی کو وہ بساند ماری جرابیں بچ باکس سے ملتیں جب وہ اس کو بچ رکھنے کے لیے کھولتی۔ رکھ کر دو چھٹیس بیٹے کو دھری جاتیں اور پھر وہی جرابیں جن میں برائے کی خوشبو بسی ہوئی ان ہی رنگین جرابوں پر چڑھا کر اسکول روانہ کیا جاتا۔ اور اسی بدبو کے مارے بچ باکس میں ہی کچا پکا پر اٹھار کھو اٹانہ بھولا جاتا۔!

پیر بے تماشاً تھا مگر رکھ رکھاؤ کا فائدہ ان تھا اس گھر میں۔ محکم کے ایک کونے میں بھینس بندھی تھی جس کی مکمل دیکھ کر رکھ میاں جی اور بے جی کے ذمے تھی۔ اس بھینس کے بڑے ناز خیزے اٹھائے جاتے۔ نملانے دھلانے سے لے کر اس کے گوبر کے ایلے تھا پے تک۔ یہ سب میاں جی اور بے جی بڑی جانفشانی سے کیا کرتے۔ اس پوش کالونی کی بڑی نہیں انیویشن والی اس کو مٹی کے اندر داخل ہوتے ہی کوئی دانی دیوار دیکھتا تو یقیناً ”عش عش کر اٹھتا۔“ مٹی چوڑی دیوار کسی گاؤں کے کچے مکان کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ پوری دیوار گوبر کے ایلوں سے بھری پڑی تھی۔ اس تمام صورت حال سے جو ہستی جی جان سے تنگ تھی وہ کبھی نفاس و نزاکت کا مجسمہ بن جاتے۔ اطوار حرم اجمل۔!

شرکے وسط میں یہ ایک پوش علاقے پر مشتمل ایک صاف ستھری اور چھوٹی سی کالونی تھی۔ کالونی کے داخلی بڑے سے گیٹ سے پہلے تیلی کمیونیکیشن کے ڈوڈل ہینڈ کوائر کی بڑی سی عمارت تھی۔ پاس ہی بہت بڑی اسکول اور ڈگری کالج کی عمارت تھی۔ اس لیے یہاں اس قسم کے خواجہ فروشوں کی بھیڑ لگی

رہتی تھی جو چٹوری لڑکیوں کے لیے ان کے چپکے کا سلن لیے کھڑے رہتے۔!

کالونی کی کئی لڑکیاں میس زیر تعلیم تھیں۔ اور کئی تو ایسی تھیں جو نرسری میں داخل ہوئیں۔ میس سے گریجویشن کی اور پھر میس پر پرائمری کلاسز پڑ کلاسز کی پھر گریجویٹس۔ حرم بھی ان ہی چند لڑکیوں میں سے تھی مگر اس نے گریجویشن کے بعد سائیکالوجی میں ایم ایس سی کیا تھا۔ چند اچھی سیلپوں کے اکسائے پر لیچرر شپ کے لیے اپنی کیا تو سر آکھوں پر لیا گیا۔ کالج کی فوئیز اور لڑکیوں کو بڑھانے کا تجربہ اتنا برا بھی نہیں تھا۔ اور وہ تو خود بھی کالج گرل ہی دکھائی دیتی تھی اس لیے جلد ہی اس کا اپنی اسٹوڈنٹس کے ساتھ دوستانہ سا تعلق بن گیا۔ تقریباً ”چھ ماہ ہو چکے تھے اسے یہ نوکری کرتے اور اب تو بڑی اچھی روٹین سیٹ ہو چکی تھی۔ کالونی کی تمام اسٹوڈنٹس صبح میم حرم کے گیٹ پر انہی ہو جاتیں اور پھر اسے لے کر واک کرتی ہوئی اسکول و کالج کی مشترکہ عمارت کا رخ کرتیں۔ یہی روٹین واپسی کی بھی تھی اس لیے حرم کو راستہ لٹنے کا پتا بھی نہیں چلتا تھا۔

آج بھی چھٹی کے ٹھیک پانچ منٹ بعد یہ ٹولا واپسی کے لیے نکل پڑا تھا۔ بھیڑ بھاڑ سے چپتی بچائی کالونی کا گیٹ عبور کیا تو منہ جیسے فضا ہی بدل گئی ہو۔ سارا شور شرابا بحث و تکرار۔ چھیاں بھنھناتے لہلہے بس گیٹ کے اس پار تک ہی محدود تھے کالونی کے گیٹ۔ وہ گارڈز بہ وقت چوکس رہا کرتے۔ یہ گارڈز آج صبح کے حالات کے پیش نظر اپنی مدد آپ کے تحت کالونی والوں نے خود ہی رکھے تھے اور ان کی تنخواہ اور خرچ چالانی ان ہی کے ذمے تھا۔

اپنی لین میں داخل ہوتے ہی حرم نے ایک لمبی سانس اندر کو کھینچی تھی۔ جیسے اپنے اعصاب کو بر سکون کرنے کی کوشش کی تھی۔ کالونی کی دوسری لڑکیاں اسے گھر کے قریب چھوڑ کر خدا حافظ کستی تیزی سے آگے نکل گئیں۔ وہ چند لمحوں میں کھڑی

ربی اور پھر ایک اپنی سی نگاہ اپنے گھر سے پہلے گھر پر ڈالی۔ باؤنڈری وال میں آرائشی روزان سے بنے تھے جن سے اندر لان کا منظر بخوبی دکھائی دیتا تھا۔ وہیں بودوں کو پانی کی موٹی دھار سے تراوٹ پہنچائی جا رہی تھی۔ اس کی نظر پڑنے کی دیر تھی کہ پائپ کا سرخ یک دم اس کی جانب ہوا۔ وہ اگر تیزی سے دائیں جانب نہ اچھلتی تو زبان نہ سہی کچھ نہ کچھ تو پانی اپنا کالم دکھا جاتا۔ اس نے گہرا کر کن اکھیوں سے ارد گرد دیکھا تھا اور پھر دل ہی دل میں دو گلیاں بدلتے "چیش کرتی گیٹ پار کر گئی۔ جو حسب دستور کھلا تھا۔ اندر کا منظر بھی وہی باقی سا تھا۔ لڑتے بچے، کھتے بچے اور جھنجھلائی مائیں۔ اس نے برا سامنے بنا کر سارے صحن میں طائرانہ نظر ڈالی۔ تالی اور امی پکن میں تھیں کہ روزانہ اس کے پیچھے ہی مردوں کی بھی آمد ہوتی تھی اور نہیں تو میاں جی اور تایا جی تو ضرور ہی آجاتے تھے گھر کھانے کے لیے، جب کہ اس کے ابو اور اوس بھائی کبھی کبھار ساتھ ہوتے تھے ورنہ تایا جی کھانے کے بعد آدھا گھنٹہ آرام کرتے اور پھر دونوں کا کھانا ٹفن میں ساتھ ہی لے جاتے۔

بے بسی روز کی طرح لمبے چوڑے برآمدے میں بچے لمبے چوڑے پلنگ پر پیر پیرے بڑی تھیں اور مختلف اوقات میں "پیٹ کشیں" ہوا کھانے مینے کے سالن کی باقیات ان کے ساتھ ہی نیم دراز تھیں۔ صحن اگرچہ دھلا دھلایا صاف ستھرا تھا مگر گیٹ کے بائیں جانب پچی کے بیڑ کے نیچے بندھی بھینس روز کی طرح اس کی کوفت میں اسٹائے کا سبب بنی تھیں۔ کبھی یہاں پر بھی ایک خوب صورت سالان ہوا کرتا تھا مگر پھر بے جی اور میاں جی کو خدا جانے کیسا وجہی کہ گاؤں سے موٹی تازی ہٹی کئی بھینس منگوالی۔ کم بخت نے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی بودوں پر منہ مارنا شروع کیا تو بودوں نے تھوڑا شور مچایا کہ سارے بودوں کا بیڑ غرق ہو جائے گا۔ کیا ریاں برپا ہو جائیں گی۔ بھینس منگوالی ہی تھی تو پہلے سے کہہ دیتے ملی سے کہہ کر سارا لان خلی کر دیتے تو جواب میں میاں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

| کتاب کا نام | مصنف | قیمت |
|------------------------|--------------|--------|
| ہمدرد | احمد علی | 500/- |
| درہم | رامدھانی | 1000/- |
| زنگی اکہوٹی | رعانہ سعید | 500/- |
| خوشبو کا کوئی گھر نہیں | رعانہ سعید | 200/- |
| فردل کے بندھے | شاپرہ پھری | 500/- |
| حیرت نام کی شہرت | شاپرہ پھری | 250/- |
| دل ایک شہر ہے | آبہ رزا | 450/- |
| آنکھیں کا شہر | فاطمہ طارق | 500/- |
| بہل بھلاں جی بکریاں | فاطمہ طارق | 600/- |
| بھلاں سے بھگالے | فاطمہ طارق | 250/- |
| بگیاں سے چارے | فاطمہ طارق | 300/- |
| بھگت سے بھگت | فخرانہ عزیز | 200/- |
| دل سے دل سے | آسمانی | 350/- |
| گھر، ہاٹیم، گلاب | آسمانی | 200/- |
| دھم بھم جی بھائی سے | فوزیہ انصاری | 250/- |
| لداں کا نام | مٹھی سیّد | 200/- |
| رنگ خوشبو بادل | ملالہ انصاری | 500/- |
| دھڑکے طے | رجیہ بیگم | 500/- |
| آج صبح چائے نہیں | رجیہ بیگم | 200/- |
| صدی حزل | رجیہ بیگم | 200/- |
| ہر حال سے سدا | فہم فریدی | 300/- |
| جی رہی مدد ملے گی | مہرینہ شکیل | 225/- |
| شام آرزو | ام سلمہ خفر | 400/- |

کامل رجسٹرڈ پبلشرز اور ڈسٹریبیوٹرز
پتہ: 222/6393
فون: 222/6393

لے کھڑ کر لی پائی جاتی۔ گو نگلو میاں نے جب خیریت دیکھی تو بڑی ہنس کے ذرا قریب چلے آئے جس کے تہور خطرناک حد تک جارحانہ تھے۔

”پر تیز، گدھے۔ کوئی تیز ہے جس میں نہیں۔ اگر یہ بل میرے منہ پہ لگ جاتی تو کل میں کس منہ سے کلج جاتی۔ بولو۔ جواب دو۔“

”پڑ کو انڈیاں (ہسلنے) کا منہ پھڑنس۔“ گو نگلو کے منہ کھولنے سے پہلے ہی بے جی کی مردانہ کم زبانی آواز سارے میں گونجی تھی۔ وہ ایسی ہی تھیں۔ جہاں کوئی بھی ان کے پوتوں کے مقابل ہونے کی کوشش کرتا وہ یوں ہی نازل ہوا کرتی اور گو نگلو میں تو بے جی ان کی جان بھی۔ حرم تھکے تھکے قدموں سے گو نگلو کو گھورتی بے جی کے بیڑ پہ دھپ سے جا بیٹھی۔

”مہولی ذرا۔ میرے جینز واسے اے جو کا فٹنس۔“ بے جی نے جوتے اتار کر پاؤں مسلی حرم کو گھور کر کہا۔ یہ بیڑ واقعی ان کے جینز کا تھا جو پوری آب و تاب کے ساتھ برآمدے میں سجا تھا۔ ٹھوس لکڑی اور پرانے کارنگیوں کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت۔ ہر سال نیا پالش کرواتی تھیں۔

”کس سوچ میں ہے اور میری صبح نولوی گھور رہی ہے۔“

”میں نے کیا سوچتا ہے بے جی۔ بس یہ ہی سوچ رہی تھی کہ کیسا ہرا بھرا لان اس کالے منہ والی بھینس کے پیچھے برپا کیا اور روز میری واپسی پہ انہا پر مجھے گھور رہی ہوئی ہے جیسے اس کا دودھ صرف میرے ہی معدے میں جانا ہے۔“

”پڑیل تھی، مکھن، ہلے تے دہی وی۔“ بے جی نے چار چیزیں اور گنوائیں۔ حرم انہیں گھور کر رہ گئی۔

”ہاں تو میں اکیلی تو نہیں کھاتی پتی۔ اب کوئی ناشتے میں میرے آگے دیکھی تھی کارا تھا۔ دودھ یا کسی کا بھرا گلاس رکھے گا تو میں اس سے یہ کہوں گی کہ مجھے یہ سب ہضم نہیں ہوتا۔ جناب میرے لیے غیر معیاری ناشتے کا بندوبست کیا جائے۔“ حرم نے ساری طعن باہر نکالی تھی جیسے۔ پھر بھی تسلی نہیں ہوئی تو بولی۔

جی اطمینان سے بولے۔

”میں فکر کرو ہوں لو کڑو۔ اس صبح آپ ہی سارا کچ چٹ کر دے گی۔“

کوئی۔ انہوں نے طنز کو اپنی نے بھینس کا متغصنا دیا۔ اس کے بعد کس کی جھل بھی جو کچھ بولتا۔

وہ دن میں دہلی ہرے بھرے لان کی جگہ صحیح شاخوں والے اکلکھویدے اور مسلی روندی ہوئی گھاس بھی بھی مزید چند دن گزرے تو میاں جی نے ٹاپس لگوا دیں اور یوں لان کا نام و نشان ہی مٹ گیا جس کا حرم جیسے تنگیوں اور اوس کی بوندوں سے پیار کرنے والی حساس لڑکی کو خالص قلق تھا۔ شروع شروع میں اہل علاقہ نے اس کالونی میں ایک عدد بھینس کی موجودگی کی بابت سنا تو خاصے چسپاں تھے۔ پھر ہوئے، مگر کہہ کیا سکتے تھے اور پھر دھیرے دھیرے ہسائے بھی خالص دودھ دہی سے اکثر فیض یاب ہونے لگے جو دینے میں بے جی کا ہاتھ بہت کھلا تھا۔ لہذا یہ بھینس اس منڈ اور پڑھے لکھے افراد پر مشتمل کالونی کی پہلی اور آخری بھینس تھی جس سے سب ہی مانوس ہو چکے تھے سوائے حرم کے۔ اسے آج بھی جنم سے بھیگی گھاس پہ ننگے پاؤں چل کر ناپاؤ آتا تھا۔ موتیا، گلاب اور رات کی رانی کی خوشبو ستانی تھی۔ تنگیوں جیسے آج بھی اس کے ارد گرد رقص کرتی تھیں۔ اسے لگا کہ کوئی بھولی بھینسی پروں پر دلکش یادوں کے رنگ سینے خوش رنگ تلی اس کی اور اڑتی چلی آ رہی ہے۔

”او آئی منہ پیچھے تھریں۔ گیند لگنے لگی ہے۔“

یہ گو نگلو تھا اس کا چھوٹا بھائی جس کی بروقت چٹکھارائی آواز۔ اسے ہوش میں لائی تھی اور وہ ایک جھٹکے سے نیچے کو جھکی تھی ورنہ گیند اس کی ناک کا بن دباتی گزر جاتی۔ سانس اٹھل پھل ہو کر رہ گیا تھا۔

نئے وہ سندھ پروں والی تلی کی صورت افسانوی سلو موشن میں دیکھ رہی تھی وہ بڑی بل تھی۔

شکر اس نے تلی کو اپنے گالوں کا لمس لینے کی اجازت نہیں دی۔ ورنہ اس وقت برف کی ٹکری ہاتھ میں

”تائی تو کھاتی ہوں نامیں۔ جیسے اور کوئی کام ہی نہیں کھاتے رہنے کے علاوہ۔“

”صرف کھاتی نہیں، لگاتی وی کہہ چتر۔ کچے دھ میں ہلدی ملا میں تو نہیں اپنا بوتھا چکاتی کسی میں اپنے چار پل دھو کر مجھے کیا کرتا ہے۔ مکھن میں شہد ملا کے منہ پر پلستر (مسک) کرنے کا بھی مجھے کوئی شوق نہیں۔ پس جی۔!“

”الہ۔ کوئی“ باریک بینی اب وارڈ“ ہوتا تو یقیناً رچی کو ہی ملتا۔ کیا نظر رکھی ہوئی تھی۔ اللہ تو! حرم نے جواب نہ سونہنے یہ تھوک نکلے ہوئے منہ پھیر کر فحش سے بھنوس اپکائی تھیں۔ نظر ٹھہری ہی دوبارہ بھینس کے اور بھی۔ ہونہ! کہہ کر منہ پھیرا ہی تھا کہ دھاڑے نیم وائٹ کو باؤنڈری وال سے مار کر گٹ کی ہی چولیس ہلا دی گئی تھیں۔ آنے والے میاں جی تھے اور ان کے پیچھے تلیا جی۔ جن کے ہونٹوں پہ دلی دلی سی ہنسی تھی اور چہرے پہ ہلکی سی سرخی۔

میاں جی البتہ بے حد عصبے میں تھے۔ یقیناً کچھ ہوا تھا۔ حرم نے جلدی سے جگہ چھوڑی اور بے بے کے ارد گرد سے بڑے چھوٹے برتن ہٹائے۔ میاں جی کو عادت تھی میٹھے میں چیریں پھینتے تھے۔ یہ تو جی کا وزن زیادہ تھا اور تائی میاں جی سے بعد کچھ بھی نہیں تھا۔ اور پھر بے جی سے متھا لگا بھی آسٹن تھوڑا ہی تھا۔ پیدائشی صحت مند اور زور آور تھیں۔ اور سے ویسی خوراکیں۔ جوان ہوئیں تو ایسی تو مند لگیں کہ کن ٹٹے (پولون نماد معاش) شرابا جی۔ تلیا جی اکثر بتاتے تھے کہ میاں جی کی والدہ مرحومہ یعنی اپنی دادی سے انہوں نے سن رکھا تھا کہ میاں جی شادی کے وقت خامے مریض سے تھے۔ مطلب مرل سے۔

بے جی سے شادی ہوئی تو انہوں نے سب سے پہلے میاں جی کو کھلا کھلا کے جوش میں پھونک بھری تھی۔ ان ہی دنوں کا قصہ تھا جب میاں جی کی صحت مندی ”ابتدائی مراحل“ میں تھی۔ ایک دن آدھی رات کے بعد کسی اچھے نے دیوار پھلانگی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے اور سب ہی مکھن میں سوئے ہوئے تھے۔

دھب کی تواز کے ساتھ ہی میاں جی کی آنکھ کھل گئی تھی، مگر اندھیرے میں جو ہول سا نظر آیا، وہ غمسا لبا جوڑا تھا۔ سوتے بن گئے۔ آنکھ تو بے جی کی بھی کھل گئی تھی اور بے جی کی دلیری کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کلن کا سارا زور سرہانے رکھ کے سوتی تھیں۔ چیل بھی نمار منہ دیکھتی تو کبھی نہ جھپٹی۔ میاں جی کو اندازہ تھا کہ جو بھی ہے زور اٹھا کے نکل لے گا۔ لڑ بھڑ کر صورت حال ٹھکین نہ ہو جائے۔

جیسے ہی اچکے نے بے جی کے زور پر ہاتھ ڈالا۔ بے جی نے جھٹ کلائی پکڑ لی اور اس زور کی موڑ کر پٹختی وی کہ نصیبوں کے مارے چور کے جی نکل گئی۔ بس پھر کیا تھا وہ کلائی چھڑاتا اور بے جی مزید کس لیتیں۔ ساتھ ہی ساتھ میاں جی کو تواز دیر جانی تھیں، مگر میاں جی کو تو جاگنا ہی نہیں تھا تا کسی صورت۔ لہذا بے سدھ بڑے رہے۔ بے جی نے میاں کی چارپائی کو ایک ٹھڈا مارا اور اٹکا ٹھڈا چور کی پٹلی میں تھوک دیا۔ وہ وہیں کا وہیں فری ہو گیا۔ پٹلی ٹوٹ گئی تھی شاید۔ بے جی نے اسی پر بس نہیں کیا۔ چارپائی کی چادر کھینچی اور لیٹ دیا چور کو پیچ میں۔ مڑی کے جالے میں پھنسی کھنسی کی طرح لپٹے چور کو دو چار لت (ٹانگ) ہوئی رکھ کے، مزید تھوکریں لگائیں اور سکون سے چارپائی پر بیٹھ کر میاں جی سے بولیں۔

”میں نے تمنا بیل (تلیا) کے الب! بہن کھول لو اکھال۔ کج فحش کرنا قسمی۔ بس اٹھ کے رولا پاؤتے لو کلنوں اکھا کر کے ایس خبیث نوں سنتیاں دے حوالے کر۔ جو یہ کام بھی میں نے ہی کیا تو تم صبح کیا منہ دکھاؤ گے لوگوں کو۔ قسمی سویرے منہ دی دکھانا لے لو کلن تو۔“

میاں جی نے شراب شری منہ سے چادر ہٹائی اور پھر بیوی سے نظر ملائے بغیر چور پر پل پڑے۔ دو چار تھوٹے مارے اور بقدر ضرورت لائیں رسید کر کے کھینچے ہوئے گھر سے باہر لے گئے۔

اگلے دن پورے پنڈ میں میاں جی کی بھلوری کا شہو تھا۔ مگر اس دن کے بعد سے بے جی نے مزید جان مار

دی میاں جی کو پہلوان بنانے میں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ستر سال کی عمر میں میاں جی کی صحت جو انوں کو مات کرتی تھی کہ گھوٹا مار کر دیوار توڑیں اور جب انسان میں لڑنے بھڑنے کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہوں تو وہ غصہ و رعب بھی ہو جاتا ہے۔ سو میاں جی بھی تھے ذرا ذرا سی بات پہ بھڑک اٹھتے تھے۔ جیسے اس وقت غصہ میں بھرے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ پیچھے پیچھے تایا جی بھی تھے جن کے چہرے پر دلی دلی ہنسی کی جھلک تھی۔ حرم فوراً بات کی تردید تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے بے اختیار دانت پیسے تھے۔ جھٹ سے انہی اور میاں جی کے لیے جگہ چھوڑی پھر پانی لاتی بھا بھی کے ہاتھ سے گلاس پکڑ کر خود میاں جی کو پیش کیا۔ بھا بھی اس کی اس حرکت پر مسکراتی واپس مڑ گئی۔ تایا جی کو بھی پانی پلا کر وہ وہیں بے جی کے ذرا پیچھے آکھڑی ہوئی۔ اس کے حواس جو کس تھے۔

”میں نے کہا کی ہوا جمیل کے ابا۔۔۔ آج تے بڑے تے سپاہی بنے آئے ہو۔ ذرا مزاج جگہ پر لاؤ اور سدھی سدھی گل کہو۔“ بے جی کی گھر کی نما پڑاتل ہمیشہ سے میاں جی کو نرم کر دیتی تھی مگر آج شاید زیادہ ہی طیش میں تھے جب ہی خاطر میں نہ لائے اور اوپچی آواز میں منہ اوپر کر کے غصے سے بولے۔

”چرا پتر۔ شوا نہ ہووے تے۔ لنتکا مشنڈا۔ کسی دن دودھ کے منکا تر وڑ دتا ہے اور پچی موڑ دینی ہے اس کی میں نے مذاق کرتا ہے۔“ میاں جی نے سارا طیش مننے اور پچی پہ نکالا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ سب دیوار پار والوں کو سنایا جا رہا ہے۔ حرم نے تھوک نکل کر گھاکر کیا تھا اور آنکھیں زور سے میچ کر دوبارہ کھولتے زیر لب بڑبڑاتی۔

”لو کا پٹھا۔“ بے جی سے تایا جی کے مسکراتے چہرے پر نظر ڈالی تو انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی سی دی۔

”اوہو۔ جمیل دے ابا۔ سچی کس دی موڈنی اے تے منکا کس دا توڑتا ہے مرغیاں پکڑ کے لائے ہو کیا؟“

”کڑی کا تو پتا نہیں، مگر اس کڑی کا خیر میرے ہی ہاتھوں ہے۔ اک نمبر دا دو نمبر منڈا ہے یہ اپنا حسین احمد کا نواسا۔ میں کہتا ہوں کھسلا نول کھلاں ڈگریاں جو اگر قیصر نہیں تلی تو بے کر بھیجا بیٹن دیا میرا۔“ بے جی خاموشی سے گھٹنا کھڑا کیے دونوں ہاتھوں سے اسے گھبے کی طرح تھامے سن رہی تھیں۔ پتا تھا بیاں جی اصل بات ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی کریں گے اور پھر بے جی کی آکھاٹ کا اظہار ایسا ہی تھا۔ غصے سے تایا جی کی طرف دیکھا اور بولیں۔

”وے جمل پتر۔! تیرے ابا جی دی لڈی نکل جلیں اے پر گل نہیں کٹی۔ تو اس کی ہویا۔؟“

”کچھ خاص نہیں ہے جی۔“ میاں جی نے بیٹے کو تیز نظروں سے گھورا تو تایا جی کو جواب بدلتا رہا۔ ”نہیں، نہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کچھ خاص نہیں بلکہ بہت خاص مسئلہ ہے۔ اصل میں ابھی میں اور میاں جی جب واپس آ رہے تھے تو ہم نے اور بس سے کہا کہ ہمیں سڑک کے کنارے ہی گاڑی سے اتار دے۔ چار قدم ہی تو ہیں۔ ایسے ہی چلے جائیں گے۔ اور بس ہمیں اتار کر گاڑی لے گیا۔ جب ہم ساتھ والوں کے گھر کے آگے سے گزرے تو چاچا جی کا نواسہ اپنے لان میں مولی دھار والے پائپ سے پانی دے رہا تھا۔ اسے شاید ہم پر بھی کسی چلتے پھرتے پودے کا گمان ہوا جو دھار کا رخ سیدھا میاں جی کی طرف کر دیا۔ پاؤندری دال کے اوپر سے یہ۔ مولی سی دھار فوراً اس کی صورت ہم پر آئی تھی۔ یہ تو عین وقت پر ہم سنبھل گئے ورنہ پور پور بھگ جاتے اور میاں جی تو بیچتے بچاتے بھی تھوڑی بہت کیلے ہو ہی گئے۔ بس اسی بات کا غصہ ہے انہیں اور اب میاں جی کہنا کھانے کے بعد حسین پچا کے گھر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

آخر میں تایا جی کی آواز میں بے چارگی تھی جیسے وہ میاں جی کے حسین پچا کے گھر جا کر لڑنے پر بالکل آمادہ نہ ہوں۔ حرم نے میاں جی کو دیکھا تو وہ واقعی کچھ ”یلے یلے“ سے لگے۔ تب بند تو کالی گیلیا تھا ان کا کچھ

بھی تھا اسے یہ بدترینی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔

خود بھی بمشکل پانی کے ”شر“ سے بچی تھی۔

”کوچھڑووی جمیل دے ابا۔“ بے جی نے ناک پر

سے کھٹی اڑائی۔ ”آج کل دے منڈے تو پھر اس

طرح کے شرارتی نہیں۔ جس طرح دے تسی اپنے

دیلے اچ سی۔ یادیں تسی تے اشفاق کو جی نوں اٹھا

کے چھڑے ڈال دتا سی۔ بچارے کو چھ دن بخار رہا تھا۔

چھڑ پتنگن لاس تے جو نکال دیکھ کر۔“ میاں جی

خشکس نظروں سے بے جی کو گھورنے لگے۔ کچھ

دیسے سے پڑ گئے تھے بے جی کون سا بس ہوئی تھی۔

”راٹو یادے تل۔ آرائیاں دی کڑی۔ اودے

لاڑے (لما) کا کیا حال کہنا سی۔ بارات توں اک دن

پیلے دچارے دی (سوئے ہوئے) غڈ کر دی۔ لے

دس! اگلے دن گھوڑی اتے نما چڑھیا تے گنجا کھو تاگ

رہا تھا۔ لوگ اتنا ہنسے کہ ان کے پیٹ میں مروڑا پڑ گئے

اور کی سناواں جمیل دے ابا۔ ذرا دسو مینو۔“ میاں

جی کیا بولتے وہ تو بے چارے بغلیں جھانکنے لگے۔ تیا

جی اور حرم کے فس فس کے پیٹ میں مروڑا پھٹنے لگے

مگر اصل مروڑ تو حرم کو پریشانی کے مارے اٹھ رہے

تھے۔ بڑی مشکل سے تھوڑی آس پیدا ہوتی تھی اور

دیوار پار کا ہمسایہ سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیتا تھا۔



”برخوردا۔ کہہ رہے چلے جا رہے ہیں۔ ذرا

ادھر کا رخ کیجئے گا۔“ نواب حسین احمد صاحب نے

ہاتھ سے کتاب سینئر نیبل پر رکھی اور چشمہ اتار کر

آنکھوں کو مسلا تھا۔ پھر دونوں آنکھوں کو حتی الامکان

بھاڑ کر سامنے مسکین و عاجز صورت بنائے نواسے کو

دیکھا۔ نواسے نے تانا کو دیکھا۔ تانا نے ایک بار پھر

نواسے کو گھورا اور اس سے پہلے کہ نواسے میاں بھی

محض دیکھنے سے گھورنے تک کا سفر طے کرتے حسین

احمد صاحب نے اسینڈلے لیا۔

”ذرا نظروں کو قابو کیجئے میاں۔ سامنے آپ کا ہم

نوالہ وہم پیالہ نہیں بلکہ آپ کی والدہ کا باپ بیٹھا

ہے۔“

جواباً ”نواسے میاں کی آنکھوں کا پھیلاؤ نارمل ہوتا

محسوس ہوا تھا۔ لہجے میں مٹھاس بھر کے عرض کیا

مکمل۔

”منا جان! ہم نوالہ وہم پیالہ تو آپ ہیں ہی۔

دیکھیے تل، بچپن سے آپ کے ”پیالے“ میں روٹی

کے ”توالے“ ڈبو ڈبو کے کھائے ہیں۔ واللہ! کیسا

خوب صورت بچپن تھا نا ہمارا۔ کسی دوست کی مانند

آپ میرے ساتھ کھیلتے تھے۔“ بڑا خواب ناک لہجہ

تھا جس میں نواسے نے بچپن کا منظر کھینچا تھا۔

آنکھیں غیر مرئی نقطے کو گھورے جاری تھیں۔

گردن ہولے ہولے گل رہی تھی جسے یک دم نور کا

جھکا سا لگا۔ تانا جان نے نواسے کی گردن اپنی چھڑی کی

پتھی میں پھنسا لی تھی اور نور دار جھکا دے کر اپنا اور

اس کا درمیانی فاصلہ کم کیا تھا۔

”جی تو چاہ رہا ہے میاں کہ ایک نور دار چمات ہم

آپ کے گال پہ دھریں۔ مگر کیا کریں۔ کہ آپ کا

قد اور جوتے کا نمبر ہم سے بڑا ہو چکا۔ لہذا ہمیں شرم

سی آجاتی ہے آپ کو سخت ست کہتے مگر آپ کو

نامعقول حرکتیں کرتے حیا نہیں آتی۔“ تانا جان نے

کڑی نظروں سے نواسے کو گھورا۔ نیت بھی سراسر

اس کی بھرپور کھچائی کی تھی۔ نواسے نے تھوک نکل کر

گھاتر کیا۔ شکل پہ مسکینی طاری کی۔ لہجہ ہموار کیا اور

استفسار کیا۔

”اے! میں ایک معقول انسان کے

ہاتھوں پلا رہا ہوں۔ بھلا نامعقول حرکتیں کیسے

کر سکتا ہوں بلکہ مجھے تو نامعقول کے بچے بھی نہیں

کڑنے آتے کجا کہ حرکتیں۔ اے! تانا جان آپ۔“

”جس کو اجازت! تانا جان نے نواسے کو سنجیدگی

سے ٹوکا تھا۔ پھر نظر کا چشمہ گلاتے ہوئے بولے۔ ”ہم

نے آپ کو خود اس بچی پہ پاپ سے پانی پھینکتے دیکھا

ہے اجازت۔ یہ تو بھلا ہو اس کی قسمت کا جو بروقت

جست لگا کر برے ہٹ گئی۔ مگر نہ آپ نے تونچ

سڑک اس کا تماشا لگا دیا تھا نا۔ پھر اسی پر بس

نہیں کیا۔ لے کے برکت اللہ اور ان کے بیٹے کا نشانہ باندھ لیا۔ ہم نے خود بالکونی سے آپ کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔“ احرار جو مکر کے لیے پر تول رہا تھا۔ تانا جان کے آخری جیلے پر ٹھنڈا ہو گیا۔

”کوئی اور ایسی حرکت کرنا تو شاید ہم نہیں دیے مگر یہ کارنامہ آپ کا تھا۔ جس کا سارا حاصل وصول ہمارے کھاتے میں منتقل ہوتا ہے۔ ہمیں بڑی سرعت کے ساتھ وہاں سے ہٹا دیا ورنہ برکت اللہ ہمیں دیکھ لیتے تو کچھ بعید نہ تھا وہیں کھڑے کھڑے کو شمالی شروع کر دیتے۔ پورے محلے کے سامنے تماشا بن جاتا ہمارا۔“

”معافی چاہتا ہوں تانا جان۔ میری ایسی نیت ہرگز نہیں تھی۔ بس یوں ہی غیر ارادی طور پر یہ شرارت ہو گئی۔ جی! احرار نے کلن کھاتے بے حد عاجزی سے غذر پیش کیا۔

”ہم مہ! آئندہ ذرا احتیاط ہی کیجئے میاں! آپ کو اس خرد مغ انسان کا پتا بھی ہے۔ لحاظ تو چھو کر بھی نہیں گزرا۔ بات کا بنگلہ بنانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ موت بھنا تو وہ جانتے ہی نہیں۔“ تانا جان شروع ہو چکے تھے۔ احرار نے قدرے بے بسی سے انہیں دیکھا اور گھٹنے کو ذرا اسیا چھوتے ہوئے بولا۔

”ایسے کیسے بات بنے گی تانا جان۔ کسی ایک کو تو نرم ہونا پڑے گا نا۔ ورنہ میرا کیا بنے گا؟“

”ہوں۔! انہوں نے آنکھیں بند کر کے پیشانی کو انگوٹھے کے ناخن سے خفیف سا کریا اور بولے۔

”بن جائے گا برخوردار! ضرور بن جائے گا۔ یہ برکت اللہ بھی بالکل انسان بن جائیں گے۔ فکر نہ کر س۔ ہم جانتے ہیں صرف ہمیں نچ کرنا چاہئے ہیں ورنہ دل کے ہیرا آوی ہیں۔“

”ارے واہ تانا جان۔ ابھی تو آپ دھڑکیے دے رہے تھے اور فوراً ہی پھول بھی ٹھڑنے لگے۔

یہ کیا سیاست ہے بھلا۔!“

”آپ نہیں سمجھیں گے میاں۔! ہر انسان کے دوسرے ہوتے ہیں۔ ایک خیر کا اور دوسرا شر کا۔ اگر کسی

انسان میں اچھائی سرے سے ناپید ہو جائے تو وہ انسان تو نہ ہوا نا شیطان ہوا۔ اور اپنے برکت اللہ صاحب شیطان تو ہرگز نہیں۔!“

تانا جان نے قدرے شرارتی انداز میں جھٹکے کے اوپر سے احرار کو دیکھا اور مسکرا دیے۔ ”جواباً“ فوٹے نے تانا کو آنکھ دے ماری۔ وہ ہٹائے بھنبھلائے اور ڈپٹ کے بولے۔

”برخوردا! یہ حرکتیں کم از کم ہماری تربیت کا حصہ تو ہرگز نہ تھیں۔ یہ کچھ برکت اللہ کے گھر میں ہم نے ملاحظہ کیا ہے۔ بستر ہو گا کہ آپ اصل ”ہدف“ یہ توجہ مرکوز رکھیے بجائے اس کے۔ کہ بزرگوں کو آنکھیں مار مار کر ان کے صبر کا امتحان لیں۔“

جواباً احرار کا قہقہہ بڑا جاندار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تانا جان کو ایسی حرکتوں سے چڑے، مگر کچھ بھی گاہے بگاہے تانا جانی کو آنکھ مارنا اور فلاںنگ کس اچھا نا اسے بے حد مرغوب تھا۔ اتنا ہی مرغوب جتنا رات دو بجے کے بعد گرم گرم کریم کلائی پینا اور ساتھ خیال یار میں کھوئے رہنا۔

”اب ذرا چاہیے اور بالکونی سے اپنی ٹانی جان کو سہارا دے کر پیچھے لے آئے۔ وہ بے چاری ہمارے لیے سیب اور پشاپانی کی قاشیں پلیٹ میں بجائے بیٹھی تھیں جب برکت اللہ کی وجہ سے ہمیں پیچھے آنا پڑا۔ ہم تو کتاب لے کر بیٹھ گئے اور وہ بے چاری ابھی تک اوپر کھلی کے تاروں پر بیٹھی چڑیوں کی کھٹی کر رہی ہوں گی۔“ اپنی ہی بات کا لطف اٹھاتے تانا جان دہلی دہلی ہنسی ہنسنے لگے۔ احرار جانتا تھا کہ ٹانی جان کے مشغلوں پر ہنستا تانا جان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ لہذا انہیں ٹوکتی نظروں سے گھورنا احرار جھٹ سے بیڑھیاں چڑھ گیا۔ پیچھے تانا جان کے بلند و بانگ قہقہے نے اس کا آخری زینے تک چبچا کیا تھا۔



”تم ایک نمبر کے بے وقوف، گدھے اور بچھے ہو۔“ وہ بے حد غصے میں پورے کمرے میں ٹہل رہی

تھی۔ راستے میں آتے غور کشنز کو اس نے ہر کے ساتھ ہی ایک ایک کر کے اچھال کر پے سے پے مارا تھا۔ بالکل سیدھ میں رکے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں وہ اپنے خون خوار تاثرات دیکھنا کسی جگر میں نہیں بھولی تھی۔

”ہرین ہرین مت کہو کسی کی طرح! میں جتنی کوشش کرتی ہوں کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جو پکڑ میں آجائے۔ تم اتنا ہی میرے ہر کیے کرائے۔ پانی پھیر دیتے ہو۔ اور جنب اس معاملے میں ”ٹرائی ٹرائی آئین“ والا فارمولا نہیں چلتا۔ پہلے تو میری ہر کو شش پر پانی پھیرا جاتا تھا اور آج نوبت یہاں تک آگئی کہ میرے گھر کے افراد کو پانی سے نسلالوا۔ واہ کیا کہنے! آپ گے رہے بغل مستی میں محترم! مجھے گھر والے کہیں اور ٹھکانے لگا ہی دیں گے۔“

وہ چلتے چلتے تھک کر بے دھیانی میں ٹھیک اسی جگہ بیٹھی جہاں غور کشنز پڑے رہتے تھے اور جنہیں تھوڑی دیر پہلے اس نے خود اچھال کر دائیں بائیں کیا تھا نتیجتاً ”دھپ“ کی تواز کے ساتھ وہ بے ہنگم طریقے سے کارپٹ پر گری تھی۔ منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور سارا غصہ موبائل کے دوسری طرف پھینک دیا۔ غصے نے بڑی غر مندگی سے پوچھا تھا۔

”حرم! تم تھک تو ہو نا۔ سوچ لگی ہے کیا؟“ حرم نے پھاڑ کھانے والے انداز میں جواب دیا۔

”پتا نہیں مینول۔ کیسے معلوم ہوا کہ وہ جاکے۔“ آخر کو خاص پنہالی تھی اور پنہالی کا غصہ پنہالی میں بول کر ہی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ حرم نے موبائل بند پہ اچھالا پھر خود بھی تیزی سے اچھال کر اس کے محفوظ ہونے کی تسلی کی کہ نوٹ جاتا تو آئندہ کے لیے فل اسٹاپ تھا۔ اس نے کوفت سے ٹھنڈی سانس بھری اور پیٹھ سسلائے ہوئے دھپ پہ ڈھیر ہو گئی۔ اس کے کھولتے دماغ کو سکون کی ضرورت تھی۔

میاں جی کے شیرو نے ٹانا جان کے چار عدد کو ترمار

کرائے تھے۔ یہ ٹھیک دو دن بعد کی تانہ خبر تھی۔ ایک بھونچال سا تھا جو اس وقت میاں جی کے وسیع و عریض مہمن میں آیا ہوا تھا۔ ٹانا جان تمام ہتھیاروں سے لیس یعنی بیج اپنی بندوق کے پورے جلال کے ساتھ مہمن میں جلوہ افروز تھے۔ ساتھ ازار اور تللی جان بھی تھے۔ تللی جان تو داخل ہوتے ہی سیدھا بے جی کے ساتھ بیڈ پر ہی پاؤں سپار کے بیٹھ گئی تھیں اور اب ان دونوں عورتوں کے سر تک جڑے رہنے تھے جب تک یہ جنگ جاری رہتی جب کہ ازار صاحب قدرے رف سے حلیے میں گھسی ہوئی جینز کے اوپر بلیک شرٹ پہنے۔ جس کا سامنے سے ایک کوٹا جینز سے باہر تھا اور ایک اندر۔ آنکھوں پر بے حد نفیس نظر کا چشمہ چڑھائے۔ بے حد لطف اٹھاتے تاثرات لیے اس ساری پتویشن کے مزے لے رہے تھے۔ دھوپ میں کھڑے ہونے کی وجہ سے رنگت دیک رہی تھی۔ حرم نے دروازے کی اوٹ سے دیکھ کر نظر اٹائی تھی۔ وہ ایسا ہی تھا سحر انگیز اور اپنا آپ منوا کے سب پر چھا جانے والا۔

گھر کی دیگر خواتین بھی اس شوٹنگ کو ملاحظہ کرنے کے لیے وہیں برآمدے میں برائمان تھیں۔ چروں پر دبا دبا سا دوش تھا۔

”ہم کہتے ہیں، لے کر آئیے ذرا اس ناہنجار کو ہمارے سامنے۔ آج تو وہ بد بخت ہمارے ہاتھوں سے نہیں۔ بچے کا۔“ ٹانا جان نے بندوق سیدھی کرتے ہوئے کرج کر میاں جی کو مخاطب کیا تھا۔ جواب میں میاں جی نے جو سکون سے مہمن کے تینوں بچ چار پائی پہ بیٹھے۔ حقہ گر گزار رہے تھے۔ ایک آٹھ بند کر کے ٹانا جان کو دیکھا پھر ایک لہبا سا شیش بڑے اسٹائل سے لیا۔ تہ بند ذرا سا اچکا یا اور پنڈلی کو کھجایا۔ پھر کھجایا۔ ٹانا جان کو شدید کوفت ہوئی ان کی اس حرکت سے۔ انہوں نے ناگواری سے گھورتے ہوئے ایک دفعہ پھر استفسار کیا۔

”آپ کو لگتا ہے ہماری بات؟“ سمجھتی نہیں آئی۔ کہاں سیدھ آپ کا شیر۔ آپ۔ گھر کا سور۔“

”او کیئر اسوسہ“! میاں جی نے چونکنے کی بھرپور اداکاری کی تھی۔

”او تیرا دلغ تو نہیں خراب ہو گیا حسین احمد! ایک ماساکو جسٹیلے لوں تو نے سو رہا۔ رب سے ڈر حسین احمد توبہ توبہ توبہ!“ میاں جی نے توبہ کی تسبیح کر کے دوبارہ ایک موٹا ساکس لیا۔

”یائمی مت بنائیے برکت اللہ صاحب! آج آپ کے شیرو کی موت نہیں ملنے والی۔ اس بدل نے ہمارے چار بیتی نسل کے کیوتر ہرپ لیے ہیں۔ ہم اسے چھوڑیں گے نہیں۔ ہرگز نہیں!“

”او میاں“ ہم توبہ!“ میاں جی نے خاصا بڑ کر ناٹا جان کے طرز تکلم پر چوٹ کی تھی۔

”اک تے جیجے تجھے نہیں آئی۔ ہوتا تو اکیلا ہے اور بات ایسے کرتا ہے جیسے پوری جینج (بارت) لے کر آیا ہو۔ شوبہ اندہ ہووے تے۔“

”ہم کسی بحث میں پڑنے نہیں آئے کیونکہ زبان تو آپ کی سدا کی جاسے۔ باہر ہے۔“

”کی کہیا۔ پا جامہ! او کیئر پا جامہ لوئے میں کوئی منہ دے اندر پا جامہ پایا ہوا اک۔“ میاں جی تیوریاں چڑھا تے۔ تہ بند سنبھالتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یعنی صبح معنوں میں طبل جنگ بج چکا تھا۔

”بات کو گھلایے مت برکت اللہ! ہمارے کہنے سے مراد تھی کہ آپ کا شیرو آئے سے باہر ہو چکا۔ اب ہماری برداشت تمام ہو چکی۔ آپ کے اس بد قماش اور آوارہ شیر نے ہمارے بہت قیمتی و نایاب کیوتر ہلاک کیے ہیں، ہزاروں کا نقصان ہوا سو الگ۔ بہتر ہوگا کہ اسے ہمارے حوالے کیا جائے۔“

”شلو والی شلوا! اتیری جڑاٹ کیسے ہوئی حسین احمد کہ تو میرے شیر کو آوارہ اور لنگا کہے۔“

”ہم نے لنگا نہیں۔ بد قماش کہا۔ ناٹا جان نے فوراً“ تھج کی تھی۔

”آہو اولی اولی! میرے شیر کو تو نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ جا کے اپنے آوارہ کیوتر سانجھ جو سارا

دن لوگوں کی چھتوں پہ بیٹھے محن میں پھرتی رہیں ناڑے رہتے ہیں۔ کٹے کٹے کے کیوتروں کے پیچھے میرے نسل بے نون بد نام نہ کر سبھا!“

”اونب! نسل اور بعد طننت جانا۔“ ناٹا جان نے نخوت سے سر جھٹک کر بندوق کو ایک ہاتھ سے دوسرے میں قفل کیا۔

”سارا زانہ جانتا ہے کہ وہ بلا آپ کو عقب میں بنے کچے چوترے کے نیچے نیم جان حالت میں پڑا ملا تھا جسے بعد ازاں آپ نے ولا جی مشہور کر دیا۔ حالانکہ وہ منحوس شکل سے ہی بدل نسل لگتا ہے۔“

”او بس کر اوئے بس!“ اس سے پہلے کہ میری بس ہو جائے۔ بڑیاں سن لیاں تیریاں بونگیں۔ اپنی یہ چھپکلی مارن والی بندوق پکڑتے گھر جا۔ اگلی داری میں شیرو لوں سبھا دوں گا کہ تیرے کیوتروں کی طرف نہ دیکھے۔ چل شلواش۔“ میاں جی غالباً نہیں یقیناً گھسیا گئے تھے اور اب قدرے پکارتے ہوئے ناٹا جان کو گھر کی راہ دکھائی۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا برکت اللہ۔ آپ سیدھے سبھاؤ اس ناٹا جان کو ہمارے حوالے کیجئے ورنہ ہم آپ کے خلاف رپورٹ دوں گے کہ آپ اپنے بے کے ذریعے ہمارے گھر چوری کر رہے ہیں۔“

”او تیری توبہ! تو میرے خلاف تھانے میں جائے گا۔ گھر ذرا تیری تو میں ابھی سچی موڑتا ہوں۔“

میاں جی کو چوری کے الزام نے طیش دلا دیا تھا وہ سارے لحاظ بھلا کر جھپٹنے کے انداز میں ناٹا جان پر حملہ آور ہوئے تھے مگر اس دوران گھر کے موز جو ہمیشہ کی طرح خاموش تماشائی بنے ابھی تک کی صورت حال سے حظ اٹھا رہے تھے۔ یک دم حرکت میں آئے تھے۔ جمل تانیا نے میاں جی کو پیچھے سے بانٹیں ڈال کر جکڑا تھا۔ زور آور تو میاں جی بلا کے تھے۔ اس لیے انہیں قابو کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ حرم کے ابو اہمل صاحب بھی اپنی قدرتی پھنسی پھنسی سی تواز میں دونوں فریقین کو ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش کرتے

لگے جمل تباہی کے اشارے پر احرار نے تاجان کو قابو کر کے گیت کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ جو مسلسل طیش نما بڑبڑاہٹ میں بندوق کی ٹل کارن میاں جی کی طرف کرتے۔ پھر جھکا لیتے۔ ساتھ ہی ساتھ گردان جاری تھی۔

”ہم چلا دیں گے۔ واللہ ہم چلا دیں گے۔“
”آج تو حد ہو گئی۔ آج تو ہم چلا ہی دیں گے۔“
اور بندوق میں چلا ہوا کارتوس تھا یہ صرف احرار جانتا تھا۔

وہ چیخ و کار بھی تھی کہ حرم نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔ دیگر عورتیں منہ کو دوپٹوں کے پلوں سے دبائے ہنسی بھیجے بیٹھی تھیں۔ باقی سب جو ہنسی کر رہے ہوں۔ تالی جان اور بے جی نے کروشیے کے نمونے ایک دوسرے کو سمجھالے تھے۔ اچار میں کرپے کس طرح سکھائے ڈالنے ہیں یہ بھی بتا دیا تھا۔ چند روٹے بے جی نے ہموؤں کے روٹے تھے۔ اور اب تالی جان تاجان کے سر پر باقی رہ چکے تکتی کے چند بالوں کو بچائے رکھنے کا ٹوٹکا معلوم کر رہی تھیں۔ جواب میں بے جی نے پرانے اچار کا تیل سر پر مالش کرنے کو کہا تھا۔ کار کر تھو تھا۔ منجانب بھی ہوا ہو جائے۔ مگر اچار کا مسالے دار تیل اور وہ بھی تاجان کے سر پر مالش! کیسے کس طرح۔

انہوں نے باؤسی سے اپنے بچوں پر ایک ایک کے لڑتے تاجان کے دھوپ میں چمکتے سفید کھال والے سر کو دیکھا اور دل ہی دل میں خود کو تسلی دے ڈب بھلا اس عمر میں اب بیل اگا کر کیا کرنے تھے۔ کون سا کہیں رشتہ لگانا تھا۔ نواب صاحب کہیں بیل آجانے سے آئے سے باہر ہی نہ ہو جائیں۔ انہوں نے مطمئن سی نظر ان پر ڈالی اور دوبارہ بے جی کی جانب متوجہ ہو گئیں کہ وہاں تو ابھی لڑائی زبردوں پر بھی اور یہ گولہ باری کئی دن تک جاری رہتا تھی۔ بھلا بیوں کی ایسی چپقلش میں بچوں کی دال کیا گلے کی۔ احرار نے نچلا ہونٹہ انتوں میں دبا کر مستف ہو کر سوچا تھا!

تاجان اور میاں جی کا یہ کوئی پہلا معرکہ ہرگز نہیں تھا۔ ہر دو سرے دن کا تماشا تھا۔ اب تو کالنی والے بھی جان چکے تھے۔ سب کو پتا تھا کہ ان دو گھروں کے بابوں کی آپس میں نہیں بنتی۔ موقع چاہے خوشی کا ہو یا غمی کا۔ یہ دو حضرات بھڑنے کا موقع ڈھونڈ لیتے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ آخر سرود گرم جنگ کے پیچھے وجوہات کیا ہیں سوائے گھر کے بیڑوں کے۔! باقی رہ گئی آل اولاد تو وہ محض قیافے لگاتی تھی۔

بے جی کے لیے اور گھنے بالوں میں دسی سہمی کا مساج کرنی حرم کا ذہن مسلسل الجھ رہا تھا۔ کچھ گتھیاں تھیں جنہیں سلجھانا تھا مگر وہ سلجھتی نہیں تھیں۔ بے جی پر اپنی عنایت کی وجہ بھی کبھی تھی کہ آج اس کا پورا ارادہ تھا کہ وہ انہیں کریدے گی۔ مگر نہ کہاں ان کا بالوں سے بھرا ہوا سر اور اس پر دسی سہمی کا مساج۔ جس کی ہنک سے ہی حرم کو گونٹ ہوتی تھی۔ اس عمر میں بھی بے جی کے بل سنبھالنے مشکل تھے۔ اس قدر گھنے اور صحت مند تھے اور ابھی تک سفیدی بھی کہیں کہیں ہی جھمکتی تھی۔ ساری عمر بالوں کی جڑوں میں دسی سہمی لگایا تھا۔ بقول ان کے یہ اسی کا کمال تھا۔ حرم نے بلکے ہاتھوں سے مساج کرتے ذرا سا آگے کو جھک کر بے جی کی بند آنکھوں کو دیکھا اور پھر بھنوس اپکا کت سیدھی ہوئی اور گلا کھٹکھاتے ہوئے بول۔

”بے جی۔ سو گئی ہیں کیا۔“
”نہیں پترالو گتھ آئی تھی۔“
”میرا مطلب تھا کہ آپ کہیں سو تو نہیں گئیں۔“
اگر ایسا ہے تو میں مساج بند کر دوں۔ مگر آپ تو ہر بات کا جواب الٹ ہی دیتی ہیں۔“
”پتر جتنے پوے پوے ہتھال تیل تو مینوں مالش کیتی اے تیل۔ اس سے میرے سروج خارش ہو رہی اے۔“ بے جی نے خاصا بد مزہ ہوتے ہوئے جی جی سی آنکھوں سے رخ موز کر حرم کو گھورا پھر

47ء کا سن چڑھا تو جیسے بالکل سی بج گئی۔
ہندوستان بننے کی باتیں۔ پاکستان بننے کی باتیں۔ لہا
میں شدت سے چلرائے گئیں۔ دہے دہے لنگوں
میں منمنانے والے سینہ ٹھونک کر دودھو جٹالے
لگے۔ ایک ان دیکھی طاقت تھی جو ہر مسلمان کو مٹا
ہو گئی تھی۔ ہندو شریہندوں کو اشارہ ہوا اور پھر پیٹے
نکواریں گپائیں اور بڑے بڑے جھمرے شریہندوں
میں مفت میں ملنے لگے۔ چھتوں کے پرہلوں سے
مسلمانوں کا خون بہنے لگا۔

تیرہ سالہ برکت اللہ کا خاندان گو جرنوالہ کے قریب
ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا تھا۔ ہندو بہت قحط
کلن پڑی تھی کہ یہ سارا علاقہ پاکستان میں ہی شامل
ہو گا۔ اس لیے یہاں سے ہندوؤں کو ہی اپنا پورا راسختر
اٹھانا پڑا۔ برکت اللہ سے بڑے دو بھائی تھے جبکہ ایک
چھوٹا تھا۔ اس کے لیے تو چار شیر جو ان تھے ان سے
چھوٹی دو جڑواں بہنیں بھی تھیں۔ اللہ کی مرضی کہ
دونوں بیویاں مرض کا شکار ہو کر چل بسیں۔

ان کے دو ماموں دلی میں تھے فسادات چھوٹے تو
برکت اللہ کے دونوں بڑے بھائی دلی روانہ ہوئے۔
کوئی چھوٹا قدم نہیں تھا یہ مکمل کا دن رات بھائیوں
کے لیے ترہنہ بلکنا بیٹوں سے برواشت نہ ہوا۔
ماموؤں کو پاکستان لانے کا ارادہ پانڈھا۔ اور ابھی
جانے میں زمین دن تھے جب برکت اللہ سے چھوٹا
رحمت اللہ کھر کے پچھواڑے کنارہ الما۔ پورے محلے
میں کھرام مچ گیا۔ علاقے کا پہلا قتل تھا۔ برکت
اللہ کی ماں بچھاڑیں کھاتی رہی۔

معلوم ہوا کہ ہندو جاتے جاتے کلام دکھا گئے۔ فحری
اڑائیں ہوئی تھیں جب رحمت اللہ کھر سے حسب
معمول سپارہ زینے مسجد کے لیے نکلا تھا۔ ابھی روشنی
نہیں پھولی تھی۔ ہندوؤں کی سیالان سے لدی تیل
گاڑیاں پتی سڑک پہ چڑھ چکی تھیں جب ذرا قافلے
سے گزرنا رحمت اللہ مسلا ہندو بننے کے غصے کی آگ کو

سیدھی ہوتے ہوئے بولیں۔

”کی کم اے تیلوں کڑیے۔ اتنی اچھی تے تو ہے
نہیں کہ مینوں دیکھی تھی کی باش کرے۔ تو تے دون
تک میرے قریب نہیں پھنکتی ہے۔ جب میں تھی
لگاتی ہوں“ حرم کے ہاتھ سے پالی چھوٹے چھوٹے جی
تھی۔ کتنی جلدی پکڑی گئی تھی وہ۔ اور نہ جھج تھا کہ
بے جی۔ جب بھی دیکھی تھی لگاتیں وہ دون تک قریب
بھی نہیں بیٹھتی تھی کہ اس کی ہلک برواشت سے باہر
تھی۔ مگر آج چونکہ مطلب تھا اس لیے دل کڑا کیے وہ
یہ کام کرنے میں جُست گئی تھی۔

اس نے ایک لمبی سانس لی اور دیکھی تھی کی کٹوری
وہیں ایک طرف رکھ کے بے جی کے پیروں کی طرف
آگڑیٹھ گئی۔

”جب یہ جان گئیں کہ کوئی کام ہے تو یہ بھی جان
گئی ہوں گی کہ کیا کام ہے۔“ دھیرے سے بے جی
کے پیروں میں دھرے اور ہاتھوں میں لگے دیکھی تھی
کے نرم ہاتھوں سے ٹکڑوں پر ملنے لگی۔

”ہم۔۔۔ م۔۔۔ بے جی نے نکارا بھرا تھا۔
”میاں جی کی مت ہی تھی اے بس ہو کر کوئی رولا
نہیں۔ ہون کی بتاؤں تیلوں۔“

”پھر بھی بے جی! آخر وجہ کیا ہے۔ سب گھر
والے ملنے ملانے کو پسند کرتے ہیں۔ مسئلہ ہے تو بس
ان دو بزرگوں میں۔ کچھ تو بات ہے۔ آج تک
بہنے نہیں دیکھی، کوئی بھی موقع ہو میاں جی ہی اکثر
لڑائی کا بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ پلیز بھئی پلیز۔ آج
تو بتاویں کہ اس سارے کے پیچھے آخر وجہ کیا
ہے۔“ حرم نے مت کر کے انداز میں کہنا۔
بے جی نے ایک نظر اسے دیکھا اور بولیں۔

”چھا اچھا دیکھنی آں۔ سوچنی آں تو میرے پیروں
چٹکی طراں۔ میں ذرا خود بھی یاد تو کر لوں کہ اے
بابے کس گل توں شروع ہوئے سی۔“ بے جی اپنے
بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے بولیں تو حرم نے اور زور سے
پاؤں دبانے شروع کیے۔ اس کا دواں دواں سماعت
بن چکا تھا۔

دکا گیا۔ شاطر و مکار، شکر و اس جو رحمت اللہ کا ہم عمر تھا۔ ہمارے سے سب سے آخری بار ملنے کا کہہ کر نیل گاڑیوں کے قریب لے گیا۔

نزدیک جانے کی دیر تھی۔ سینے سے نومولود بچہ چٹائے شکر و اس کی ماں ساتھ کی مانند ہنکاری تھی۔ ”شکر کے باپو! پھیر دو دراتی اس پیچھے کے!“ شور شکر کے سنگدل باپو نے گردن اتار دی۔ چھوٹے لڑکے کے غم میں ماں کی دگرگوں حالت دیکھ کر تیرے ہی دل پر برکت اللہ کے دونوں بڑے بھائی ماموں کو لینے نکل پڑے۔ ان کے جی میں یہی تھا کہ جلد از جلد ماں کے مل جائے اور آج میں تو شاید ماں کا غم لگا ہو سکے۔ برکت اللہ نے بھی بہتری ضد کی۔ مگر اہلی ماں کے پاس بھی تو کسی کا ہونا ضرور تھا۔ ہاں۔ اور پھر برکت اللہ اکیلا ہی ماں کے پاس رہ گیا۔ پورے اٹھارہ دن بعد لاشوں سے بھری ایک ٹرین انٹیشن پر رکی تھی جس کی درندوں سے خون ٹپکتا تھا۔ سب کے سب مسافر شہید کر دیے گئے تھے۔ ان ہی کئی بچی لاشوں میں دونوں ماموں بھی تھے۔ ان کے بل بچے بھی اور برکت اللہ کے دونوں بڑے بھائی بھی! ماں بالکل نہ ہوتی تو کیا ہوتی۔ ماں جائے بھی گئے اور اپنے بچے بھی قربان ہوئے۔

ان ہی دنوں کا قصہ تھا جب گاؤں میں بڑی صعوبتیں جھیلنا ایک قافلہ آکر ٹھہرا تھا۔ اسی قافلے میں ایک نواب بیگم بھی تھیں اور ان کا بارہ چودہ سال کا لڑکا بھی۔ دونوں دریدر ہو کر رہ گئے تھے۔ قافلے کی تو منزل ہی یہی گاؤں تھا کہ سب ہی کے رشتے دار بڑے تھے مگر ان دونوں ماں بیٹا کو وقت اور حالات نے ادھر کا رخ کرنے پر مجبور کیا تھا۔ کسی کو جانتے نہ تھے کس کے گھر ٹھہرتے گاؤں کے امام مسجد خدا ترسی کرتے ہوئے مسجد ہی سے متصل اپنے بچے میں لے گئے۔ وہاں مولوی صاحب کی زوجہ ہمراہ تھیں بچوں کے بمشکل سہائی ہوئی تھیں۔ چار دن میں دونوں ماں بیٹا اب گئے۔ نوابی خون تھا۔ اتنے بڑے ٹبر میں گھبراتے نہ تو اور کیا کرتے۔ بیٹا تو سسک سسک کر

رویا۔ تمہیں بے چاری کر بھی کیا سکتی تھیں۔ دونوں اور نکلے تو برکت اللہ اور اس کی ماں آپہنچے۔ مولوی صاحب کے ہاں۔ اڑے ماں اور محبت سے نواب بیگم اور ان کے بیٹے کو لے گئے تو ماں جان میں جان آئی دونوں کے۔ یہ بڑے سے کشادہ محسن دلی کو بھی تھی برکت اللہ کی۔ دو نوکر بھی تھے۔ ایک طرف کھونٹے سے دو بیٹنیں بھی بندھی تھیں۔ کوٹھری اناج سے انی بڑی تھی۔ بڑے دنوں بعد نواب بیگم پورے طور طریقے سے نہادو کر حکمت سے محسن میں خاص ان کے لیے بچائے گئے پلنگ پر براجمن ہوئی تھیں۔ اور نواب زادہ برکت اللہ کے ہمراہ مزے سے کمرے ماپ رہا تھا۔ سارا دن چوڑیاں کرتے بیٹا تھا اور رات بڑتے ہی لیے جوڑے پلنگ پر برکت اللہ کے ہمراہ نوایوں کی مانند سو رہا تھا۔ اور اسی رات چودہری برکت اللہ اور نواب زادہ حسین خان کی انوشدو سی کی بنیاد پڑی تھی۔

آنے والے وقت میں دونوں ایک دو سرے کا سایہ بنے نظر آئے۔ برکت اللہ کے اسکول میں ہی حسین خان کو بھی داخل کروادیا گیا تو وہاں بھی دونوں کی جوڑی مشہور ٹھہری۔ حالانکہ مزاج میں بے تحاشا تضاد تھا۔ برکت اللہ ٹھیکہ و پتلی اور جنوں جیسی خوب و لا چھپلا اور حسین احمد خان لکھنؤ کی بودباش میں پنپنے والا۔ نازک مزاج اور پادشہی سامستانی فطرت کا حامل خوب صورت کا بھی والا بانٹا۔

مگر اس تضاد کے باوجود کیا غضب کی ذہنی ہم آہنگی تھی ان کے درمیان۔ اور ایسا ہی حال ماں کا بھی تھا۔ حسین احمد خان کی والدہ نواب بیگم قطب النساء کی نفیس طبع اور مدھم مدھم ہنسا بولنے والی خاتون اور برکت اللہ کی ماں۔ خالص پنجابی بھڑکیلا سالجہ لپے رنگ چودہراؤں۔

مگر شیر و شکر ہوئی تھیں دونوں۔ پہوں اپنے اپنے دکھ کھیں۔ دوئی تھیں دونوں۔ برکت اللہ کے گھر سے جنازے اٹھے تھے۔ ماں نے تین جوان بیٹے قربان کیے تھے تو کم دکھ قطب النساء بیگم نے بھی

برداشت نہیں کئے تھے۔ انہیں تو دفن کرنے کو لائے بھی نہ مل سکے بچوں کے۔ جس وقت فساد پھیلے تھے تب انہیں محض چند ہی دن ہوئے تھے۔ پورے طعنائی سے اپنے اہل و عیال کے ہمراہ لکھنؤ سے یوپی آئی تھیں۔ ان کی چھوٹی بہن کے ہاں عقد کے تیرہ سال بعد پہلوی کا لڑکا ہوا تھا۔ بڑی دھوم دھام ہوئی تھی۔ یہ بھی بہن اور بچے کے علاوہ تمام گھر والوں کے لیے تحائف کے انبار لیے پہنچ گئیں۔ دھوم تاشے، قہقہے، ٹانے پھوٹے رہے اور خبری نہ ہوئی کہ بلوائیوں نے لکھنؤ میں شب خون مارا تھا۔ ہر گھر پھونک گئے تھے۔ جس دم بیگم کو خبر ہوئی اس وقت تک شاید علاقے کے کئی گھر خون سے دھو دیے گئے تھے۔ روٹی پختی نے واپسی کا قصد کیا۔ بہن اور بہنوں کے لاکھ سمجھانے پر بھی نہ مانیں کہ شوہر کی فکر بھان کیسے دے رہی تھی۔ دل مانتا ہی نہ تھا کہ ان کو کوئی گزند پہنچی ہو۔ اس سے پہلے کہ فداوات یوپی میں بھی رنگ دکھاتے، وہ حسین احمد خان اور دو چھوٹے بچوں۔ ایک لڑکا اور ایک چھ سال کی لڑکی کے ہمراہ واپس ہو گئیں۔ نہ جانے کن عذابوں سے گزر کے لکھنؤ پہنچیں۔ کئی سرتو سوتا ہمراہ تھا۔ بہن کی طرف لڑکی ہوئی کئی تھیں اور دن میں تین دفعہ تو کینے تبدیل کرتی تھیں۔ سب کی بشکل حفاظت کرتی لکھنؤ وارد ہوئیں تو محلے کے قریب بھی نہ پہنچ پالی تھیں کہ اسماعیل کو چوان ان تک پہنچ گیا۔ نواب صاحب کا ذاتی پشتی کو چوان تھا جو صرف حویلی کی کسی دوڑا تھا۔ دیگر گوں حالت تھی، بیگم کو مختصر ساری چٹا کہ سنائی اور کہا کہ نواب صاحب نے آخری دم دیتے تاکید کی تھی کہ آپ کسی بھی قافلے کے ہمراہ پاکستان روانہ ہو جائیں۔ کسی نہ کسی طرح اسماعیل کے ساتھ گھنٹی بچوں کو پہلوؤں سے لپٹائی دوبارہ واپس مڑ گئیں۔ اسماعیل کو چوان نے اپنے ایک جاننے والے کے ہاں رات تک کے لیے ٹھہرایا اور پھر دو سراپہ شروع ہونے سے پہلے یہ لوگ پاکستان جانے والے قافلے میں شامل ہو گئے۔ بیگم کے پاس زلورہ وہ سیول سونا

تھا۔ یا پھر وہ نقدی جو ان کے شہید شوہر نے اسماعیل کے حوالے کی تھی۔ اور اب وہی اسماعیل جان اسماعیل پر رکھے اپنے مالک کا نمک حلال کرنے چلا تھا۔ قافلے میں سرایسکی تھی۔ ایک دہشت ناک خاموشی اور متوقع کٹ پیٹ کا خوف۔ لوگ چل نہیں رہے تھے۔ رینگ رہے تھے۔ قافلے کے چند بزرگ خون گرمانے کی ناکام کوشش کیے جا رہے تھے۔ مگر سب کی رگیں تک خوف سے جی پڑی تھیں۔ ابھی یہ پیدل فاصلے طے کر کے کسی نہ کسی طرح اسٹیشن پہنچنا تھا جہاں گاڑی ان ہی مسافروں کے لیے تیار کھڑی تھی۔ قطب النساء بیگم کی چھوٹی لڑکی میں کا ہاتھ چھڑوا کر۔ اکا دکا ہم عمر بچوں کے ہمراہ قافلے کے آگے چھل کر نظر آئی تھی۔ راستے کے ارد گرد کھیت تھے اور کھیتوں میں بھونکتے کیدڑ۔ اور پھر یک دم کہاں سے لہراتے بھڑکے نکل آئے۔ اور سب سے پہلے بچوں کو ہی چھوٹوں میں پرو ڈالا۔ قطب النساء بیگم نے تھمی رافعہ کی جگر چرٹی پیچ سنی تھی۔ باقی سارا منظر بھل کر ڈیس دب گیا۔ تباہی مچی تھی۔ ایک ایک کر کے بڑے چھوٹے سب کٹتے چلے گئے۔ اسماعیل نے بیگم اور دونوں لڑکوں کے ہمراہ ان ہی قدموں پلٹنا چاہا تھا جب یک دم گود میں اٹھایا چھوٹا لڑکا پھرتی سے نیچے اتر گیا۔ اسماعیل بوکھلا گیا اور اس سے پہلے کہ وہ بچے کو پکڑتا۔ بچہ دہشت زدہ سا چھین مار کر کھیتوں کی سمت بھاگا۔ غریب اپنی طرف سے جان بچانے کو بھاگا تھا مگر ایک اڑتی کپاں پیچھے سے ہی تازہ کھوپڑی چرٹی گزر گئی۔ کھوں میں بچے کی کمال ختم ہو گئی۔ چند ساعتوں میں نواب بیگم نے دو اولادیں گنوا دی تھیں۔ ہونٹ جلد، آنکھ ساکت اور دھڑکنیں تھمی ہوئیں۔ ایک مردہ ہی تھا جسے اسماعیل نے بڑی وقت سے حسین احمد خان کی مدد سے کھیتوں میں کھینٹا تھا۔ زندگی تھی جو تینوں ہی غلاموں کی آنکھوں سے اوچھل ہو گئے۔ مگر نہ بچا کون تھا۔؟

قیامت کی رات تھی جس کی صبح کرنے میں ان تین جانوں نے سو غلاب جھیلے تھے، پوچھنے سے پہلے

وہ دونوں دوستوں کے ایک دوسرے کی ہی شکت میں گزر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے وہ اب بھی پہلے جیسے ہی تھے۔ تو نکار کرنے والا برکت اللہ اور آپ جناب کرنے والے حسین احمد خان۔ برکت اللہ لاکھ چاہ کر بھی حسین احمد خان کی بولی پہ اثر انداز نہیں ہو سکا تھا۔!!

وقت کو ذرا سا دھکا لگا اور برکت اللہ کے رشتے کی بات چیت شروع ہو گئی۔ قطب النساء بیگم جی جان سے برکت اللہ کی ماں کے ہمراہ لڑکی والوں کے ہاں گئیں اور رشتہ پکا کر آئیں۔ بات چیت ہونے کی دیر تھی۔ حسین احمد خان نے ماں کو شہر بلا لیا۔ شہر میں ان کو تعلیم میں کوٹھی ملی تھی، برکت اللہ اور اس کی ماں نے بڑا دواویلا کیا۔ دھولس بجائی مگر حسین احمد خان نے طریقے سے دوست کو راضی کیا۔ وہ گھر کی ہو آنے سے پہلے شہر والی کو کھجی میں ماں سمیت سیٹ ہو گئے۔ تاکہ کل کو ہو آئے تو کوئی فسلو نہ کھڑا ہو۔ گو کہ قطب النساء بیگم اب بھی ہر چہ آٹھ دن بعد یہیں پائی جاتیں کہ ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ مگر پھر بھی حسین احمد خان مطمئن تھے۔ وہ خود بھی برکت اللہ کی شادی میں سکے بھائیوں سے بڑھ کر پیش پیش رہے تھے۔

اور پھر برکت اللہ کی شادی کے محض سوامینے بعد نواب بیگم نے چھوٹے خان صاحب کے لیے بھی لڑکی پسند کر لی۔ برکت اللہ کی بیوی ہاجرہ کی۔ جمیری بسن تھی۔ شہر میں رہتی تھی اور اس وقت کی دس جماعت پاس تھی۔ شادی میں دیکھا تو دل میں کھب گئی۔ بڑی مشکل سے تھوڑا وقت نکالا اور پھر جیسے ہی موقع ملا، برکت اللہ کی ماں اور بیوی کے ساتھ لے کر پہنچ گئیں۔ لڑکی والوں کو کیا چاہیے تھا۔ جدی پیشی نوابوں کے ہاں سے رشتہ آیا تھا۔ اور پھر ہاجرہ کی تسلی اور اصرار۔ بس یہی کرتے ہی تھی۔!

یوں چھ ماہ کے وقفے سے دونوں دوست گھر بار والے ہو گئے۔ حسین احمد خان کی شادی گاؤں میں ہی منعقد ہوئی، برکت اللہ اور ان کی ماں نے ایک نہ چلنے

اسٹیل انہیں لے کر کسی نہ کسی طرح اسٹیشن پہنچ ہی گیا۔ وہاں ایک خوش قسمت قافلہ گاڑی پر سوار ہو رہا تھا۔ گاڑی پاکستان جانے والے دیگر مسافروں سے کچھ کچھ بھری پڑی تھی۔ تسلی اس بات کی تھی کہ فوج کے سپاہی رکھوالی کے لیے ہمراہ تھے۔ اسٹیل نے بڑی تھک دو دو سے کسی سے جان پہچان نکال کر دونوں ماں بیٹے کو اس آدمی اور اس کے خاندان کے حوالے کیا۔ ساری نقدی حسین احمد کے فیصلے میں اڑی کہ نواب بیگم کو ہوش ہی کہاں تھا کسی بات کا۔ گاڑی کی سیٹی بجی تھی، اسٹیل گاڑی سے اتر گیا۔ جب کھڑکی کے رخ اسٹیل کو دیکھا تو تھا حسین احمد خان پھٹ پڑا۔ دو دو کر اسٹیل کو واپس بلائے لگا۔ اس نمک حلال نے سلاخوں میں سے ہاتھ ڈال حسین احمد کے دونوں گل تھمتھمائے اور بولا۔

”چھوٹے خان جی۔! بڑے نواب صاحب ابھی تک بے گورو کفن بڑے ہوں گے۔ میں انہیں دفنائے بغیر کس طرح آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ مجھ پر قرض ہے جی۔! کاکر لوٹ آؤں گا۔ اگر زندگی بچی تو۔!“ ڈیڈ پالی آنکھوں سے اسٹیل نے چھوٹے خان کے ہاتھ چھوڑے اور پلٹ کر بھیڑ میں مدغم ہو گیا۔ اسی قافلے کے ہمراہ یہ دونوں ماں بیٹا، برکت اللہ کے گاؤں پہنچے تھے۔ برکت اللہ کی ماں اپنے درد بھول کر قطب النساء بیگم کی دلجوئی میں لگ گئیں۔ اور پھر زمانے نے دیکھا کہ بہتلا محض خونی رشتے کا محتاج نہیں۔ بھائی چاہہ بھانے کے لیے ایک ماں کی کوکھ لازم نہیں۔

حسین احمد خان نے میٹرک کے بعد شہر میں کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ برکت اللہ نے میٹرک کے بعد سارا دھیان زمینوں پر لگوا دیا تھا۔ کچھ ماں نے بھی آگے بڑھنے نہ دیا کہ برکت اللہ کی صحت خاصی غیر صحت مند تھی اس لیے انہیں لگتا تھا کہ ان کا پتر دھالی کا بوجھ مزید نہیں ڈھو سکتا۔ لیکن اس بات سے نواب زادے اور چھوٹے چوہدری کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ حسین احمد خان اب بھی پورے استحقاق کے ساتھ گاؤں آتے اور جو چند دن گزارتے

دی۔ ہر تقریب گھوڑوں میں ہوئی اور تمام رسومات کے ساتھ۔ کون سا چاہو تھا جو برکت اللہ نے پورا نہ کیا ہو۔ دلہا کی گھوڑی کے آگے خود بھی بٹایا تھا۔ حسین احمد خان بیوی رخصت کروا کر اسی آنگن میں لائے تھے۔ کیسے ایسا روادواری والے نے نہ تھے۔ لنگر کا نہ کھول دیا تھا برکت اللہ نے۔ برکت اللہ کی ماں نے ہزاروں روپے حسین احمد خان پر سے وار کر صدقہ کیے تھے۔ نواب بیگم کی آنکھیں کسی دم خشک نہ ہوتی تھیں۔ بچہ بڑے ہوؤں کی یادیں وہ نہ کر تھیں تھیں۔ ہر ہر تقریب میں دونوں سیلیوں نے ہتھیلی سے ہتھیلی ملائے رکھی۔ ساجھے غلوں نے دلوں کو متصل کر رکھا تھا۔ سحرے لوگ اور سحرانہاں! برکت اللہ کے لیے یہ بے حد خوشی کی بات تھی کہ اس کی سرال میں حسین احمد خان کا رشتہ ہوا تھا۔ یوں سرال سامنے ہو گئی تھی۔ بر حسین احمد خان کے دل میں ایک ذرا ساقی تھا کہ کاش لڑکی کسی نواب گھرانے سے ہوتی۔ خاندانی زعم پوری آب و تاب سے دونوں میں خون کے ساتھ گردش کرنا تھا۔ اس خلش کو گزرتے وقت اور زینب بی کی اچھی تربیت نے ہی دبایا تھا۔

برکت اللہ کے ہاں پہلونی کا لڑکا ہوا تو حسین خان کو یہ بہانہ ملا کہ وہ بچے کا نام رکھے اور انہوں نے اس کا نام چوہدری محمد جمل رکھا۔ چند ماہ بعد حسین احمد خان کا پہلا لڑکا ہو کر مر گیا تو دوبارہ اس لگتے لگتے چار سال بیت گئے۔ اور پھر جب زینب بی کے ہاتھ میں پہلی بیٹی آئی تو برکت اللہ نے چچا ہونے کے بھرم میں بچی کا نام عائشہ رکھا!

زندگی ایک مخصوص ڈھب میں وقت کی طنائیں تھامے بیٹھے تھی۔ برکت اللہ کے ہاں جمل کے بعد اجمل، اکمل اور پھر ایک بیٹی فوزیہ پیدا ہوئی اور اوسر حسین خان کے ہاں عائشہ کے بعد صرف ایک اولاد زینہ ہوئی۔ زینب بی کو بمشکل بچایا گیا تھا۔ کوئی معمولی سی بچہ بڑی بڑی خرابی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور دوبارہ حسین احمد خان کے ہاں اولاد نہ ہو سکی۔ نواب

بیگم کی جان لیا ہی دو تو توں میں بند تھی۔ ضعف نے بیمار اور کمزور کر دیا تھا مگر پھر بھی پوتا بونی کے لاڈ اٹھاتے نہیں چھوڑتی تھیں۔ نوابی خون کا اثر تھا یا وضع داری کا کہ بیٹھ پوئی کو نواب زاویہ عائشہ اور پوتے کو نواب زاہد شارق کہہ کر بلایا۔ پرانی دوستی جوں کی توں برقرار تھی۔ ابھی بھی برکت اللہ کے بیٹوں میں سے کوئی ایک آتا اور آکر ”چھوٹی داوی“ کو چار چوڑوں کے ہمراہ لے جاتا اور پھر واپسی چار ہفتوں بعد ہوتی۔ وہ بھی دنیا جہان کی سوغاتوں کے ہمراہ!

سکون سے چلتی زندگی کی ٹاؤ نے پہلا بچہ لولہ کھایا۔ برکت اللہ کی ماں گزر گئیں۔ کٹھن ترین وقت میں ساتھ بھانے والی یہ عورت اپنے آخری وقت میں بھی اپنی عزیز از جان سہیلی کے ہمراہ تھیں۔ قطب النساء بیگم کے شانے پر سر رکھے ہی آخری دم نکلا تھا ان کا۔ پرسوں کا ساتھ چھوٹا تھا۔ کوئی چند دن کی بات نہیں تھی۔ اثر انداز کیسے نہ ہوتیں اور بمشکل آٹھ دس ماہ بیماری کی حالت میں کٹ کر قطب النساء بیگم بھی اپنی شہسوار کی خبر گیری کرنے کو چل دیں۔ دونوں گھرانے جیسے کم صدم سے ہو کر رہ گئے تھے۔ اور پھر دیر سے دیر سے زندگی کی گاڑی دوبارہ رواں دواں ہو گئی۔

بچے بڑے ہو گئے۔ برکت اللہ اور حسین احمد خان کی باری آج بھی سب پر بھاری تھی۔ بل برابر بھی دونوں کی دوستی کو فرق نہ آیا تھا۔ برکت اللہ کا بڑا بیٹا جمل بڑھنے لگنے کا شوقین اور اوب سے شغف رکھنے والا لڑکا تھا۔ بی۔ اے کرنے بعد بڑی ضد کر کے یونیورسٹی داخل ہوا تھا کہ ویسی سوچ والے برکت اللہ کی نظر میں اتنا پڑھنا لکھنا کسی کام کا نہیں تھا۔ مگر جمل کے اتنا آگے جانے کے پیچھے ایک وجہ اور بھی تھی۔ اور وہ تھی عائشہ! حسین احمد خان کی بیٹی۔ نواب زاویہ عائشہ!

بڑا وحیما اور بیٹھا سا تعلق تھا دونوں کا۔ ایسا تعلق جس میں ایک نظری سیر کر دے اور پھر او جمل ہوتے ہی سیری، تشنگی میں بدل جائے۔ دونوں کے مزاج ملنے تھے۔ دونوں کی دلچسپیاں اور شوق بھی ایک سے تھے۔

ادب کے دلہ اور طرز گفتگو رکھنے والے پھول جن کر ستاروں کو چھونے والے۔ ”پھول“ لگے تجھ کو تو درد مجھے ہوتا ہے“ والی صورت حال تھی۔ بیٹے کے انکسائٹ کا ہجرہ کو بخوبی اندازہ تھا۔ انہیں کیا اعتراض ہوتا بھلا زینب بی بی کی بیٹی کو سو بھانا ان کے لیے فخر کا باعث تھا۔

جمل ان کا قاتل اور انتہائی نفیس و جیسے مزاج کا بیٹا تھا۔ گردن کٹھن کے کی حد تک فرہاں ہوا۔ برکت اللہ کے برعکس ہاجرہ کو جمل کا پرہیزی سے شغف بے حد بھاتا تھا۔ وہ باقی دونوں بیٹوں اور چھوٹی بیٹی فوزیہ کو بھی آگے بڑھنے نہ آسائی تھیں مگر آفرین بھی تھیں پر کہ میٹرک سے آگے ورتہ ہی بھاڑ دیا۔ فوزیہ کی تو میٹرک میں بھی سہلی تھی جسے کلمہ کرنے کا اس نے کبھی ارادہ نہیں کیا تھا۔ وجہ باپ کی شدہ تھی۔ ہاجرہ خود چچی ان بڑھ چکی تھیں اور خیمہ پنجابی لب و لہجہ والی خالفتا کاؤں کی پروردہ۔! بچوں کے لیے ضرور خواہش مند تھیں کہ خوب سارا لکھ بڑھ جائیں تو اس کے پیچھے ایک وجہ زینب بی بی اور ان کا رہن سہن بھی تھا۔ حسین احمد خان کی شگفتگی اور شہری رہائش نے زینب بی کو خوب پالش کیا تھا۔ ان کے بچے تہذیب یافتہ تھے۔ کئی بار ہاجرہ نے چاہا کہ برکت اللہ شہر میں شفٹ ہو جائیں مگر وہ بات سنتے ہی ہستے سے اکھڑ جاتے تھے۔ ایسے میں جمل کا عائشہ کی جانب جھکاؤ ہاجرہ کے لیے بے حد تسکین و راحت کا باعث تھا کہ اسی ہانے عائشہ جیسی سبھی ہوئی لڑکی ان کے گھر آنے میں شامل ہوتی تو سب لوگوں پر لازمی اثر پڑتا تھا۔ خاصی طور پر فوزیہ کا ابا بی بی اور بد سلیقگی۔ عائشہ کی صحبت میں رہ کر ختم نہ سہی۔ کم ضرور ہو سکتی تھی۔

ہاجرہ نے موقع ملتے ہی زینب بی کے کلاں میں بات ڈال دی تھی۔ بیٹی کے دل کا حال جان کر انہیں ان محنت فکروں نے گھیر لیا تھا مگر یہ سوچ کر مطمئن ہو گئیں کہ حسین احمد خان بچپن کے دوست کو کبھی ہاں نہیں کریں گے۔ مگر ہر سوچ صحیح ثابت

ہو جائے ضروری تو نہیں!

جس دھوم دھام اور ہم جھام سے برکت اللہ اور ہاجرہ عائشہ کے لیے رشتہ لے کر آئے تھے۔ محسوس یہ ہوتا تھا گویا بارات لے آئے ہوں۔ دونوں گھر سے رشتہ بکا کر کے نکلے تھے اور یہاں پہنچتے پہنچتے شادی کی تاریخ تک ملے کر چکے تھے۔ مگر اس وقت سب کو سناٹ سو گھم گیا جس وقت ڈرائنگ روم کی سینٹرل ٹیبل کے اوپر پھولوں کے قتل میں رکھی ہیرے کی انگوٹھی۔ ہاجرہ نے بغیر کسی سے اجازت لیے ساتھ بیٹھی عائشہ کی انگلی میں سجالی چاہی۔ میں اسی لمحے حسین احمد خان نے دنگ لہجے میں انہیں ایسا کرنے سے روک دیا اور پھر بغیر لگی لپٹی رکھے اس رشتے سے منع کر دیا۔ حیرت سی حیرت تھی جو برکت اللہ اور ہاجرہ پہ جیتی تھی۔ خود زینب بی اپنی جگہ ٹھہر کر رہ گئی تھیں۔ اور عائشہ کے دل کا حال جاننے کی کسے فرصت تھی۔ اس سکتے بھرے ماحول میں حسین احمد خان نے خود ہی بات کا آغاز کیا تھا۔ اور بڑے سہان سے برکت اللہ کے قریب بیٹھ کر انہیں یہ بتایا کہ وہ عائشہ کا رشتہ چند ماہ پہلے ہی اپنے رشتے داروں میں ملے کر چکے ہیں۔ جو شخص ایک اتفاق کی بنا پر اچانک ان سے ملے تھے۔ یہ رشتہ دار کوئی اور نہیں خود حسین احمد خان کے سوتیلے چچا کے بیٹے ہیں۔ جواب بھی انہی میں مقیم ہیں۔ پاکستان کسی کلمہ سے آئے تھے اور اتفاقاً کسی مشترکہ دوست کے توسط سے ان کی ملاقات ہوئی۔ سالوں بعد ملے تھے۔ گلے گلے تو انگ ہو نا بھول گئے۔ چھ گھنٹے اسی دفتر میں دونوں بیٹھے رہے جہاں ملاقات کا سبب بنا اور جب اگلے تو دونوں اپنے بچوں کے رشتے ملے کر چکے تھے۔ نواب حسین احمد خان کے چچا زاد بھائی نواب تھمر حسن خان نے اپنے بیٹے کے لیے عائشہ کا رشتہ دیا جسے بغیر کسی پس و پیش اور سوچ بچار کے حسین احمد خان نے قبول کیا۔ اب وہ اس سے مسلسل رابطے میں تھے اور غمگین شادی کی تاریخ مقرر کرنے والے تھے۔

بڑے سہماؤ سے حسین احمد خان نے اپنی بات

رشتوں پر دوستی کو ترجیح دیں۔ اب یہ موضوع ہمیں بند ہو جانا چاہیے۔

نواب زادی عانکہ کارشتہ ہم نے حیرک حسن خان کے بیٹے طلال خان سے ملے کر دیا ہے ہم انہیں کوئی بھی نرو کی تاریخ دینے والے ہیں شادی کی۔ لہذا بد مزگی پیدا کرنے کے بجائے بچی کی شادی کی تیاری کیجئے۔ جی کھول کر چیز تیار کیجئے آخر کو دوسرے دیں جا کر رہتا ہے عانکہ کو۔ آپ چاہئے اور بچی کا ذہن آگاہ کیجئے اور دوبارہ ہمارے ساتھ کسی بھی قسم کی بحث سے گریز کیجئے گا ورنہ نتائج کی ذمہ دار آپ خود ہوں گی۔!

اور نہ نسیبی کو زندگی میں پہلی بار مت کرنا منگا پڑ گیا تھا۔ جو بھی تھا ایک بھرم تو تھا کہ وہ حسین احمد خان کے دل میں جگہ بنا چکی ہیں۔ ان کی اطاعت و ریاضت کو قبول کر لیا گیا ہے۔ مگر وہ تو محض مجبوری تھیں اور مجبوریوں کی زبان نہیں ہوتی۔ اس دن سے نہ نسیبی نے بھی اپنی زبان پر قفل ڈال لیا اور نواب زادی عانکہ نے اپنے دل پر۔!



جہل نے یونیورسٹی کو خیر یاد کر دیا۔ تمام کتابیں۔ جو وہ اور عانکہ اول بدل کر پڑھا کرتے تھے۔ انہیں صندوق میں جما کر بند کر دیا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی پر جھکی خوب صورت تختے تھے پھولوں کی تیل کو کٹواؤ والا جس پہ علی الصبح منڈلاتی تیلیوں کے خوش نما رنگ دیکھنا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ پڑھائی سے جی اجاٹ ہوا تو برکت اللہ کے کہنے پر چھوٹے بھائیوں کی طرح کاروبار میں سرکھپانے لگے۔ اور پھر جلد ہی ہاجرہ نے برکت اللہ کی بی بی راوردی کی ایک بھلی باس اور سیدھی سلوی لڑکی سے رشتہ طے کر دیا۔ جمل خاموش رہا۔ عانکہ نہ ہوتی تو پھر کوئی بھی ہوتی اس سے بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔

زندگی معمول پر آکر نہ دے رہی تھی کہ ایک دن عانکہ کی شادی کا بلاوا بھی آن پہنچا۔ برکت اللہ کے

مکمل کی تھی اور کہنے کے لیے کسی کے پاس کچھ نہ چھوڑا تھا۔ یہ پہلی دراز تھی جو اس بھائیوں جیسی دوستی میں بڑی تھی۔ برکت اللہ نے گلہ کوئی نہ کیا محض خاموشی سے پوری کا ہاتھ تھا اور اس کھن زدہ ماحول سے نکلنے چلے گئے۔ سارا سامان جوں کا توں چھوڑ گئے۔ گاڑی کے اشارت ہونے تک پیچھے رہ جانے والے نفوس سانس روکے بیٹھے رہے تھے یہاں تک کہ عانکہ کے وجود میں بھی اتنی سکت نہیں تھی کہ اٹھ کر باہر نکل جائے۔ جب کہ یہاں بیٹھ کر محسوس ہوتا تھا کہ جان جسم سے نکل جائے گی۔ سامنے باپ تھے جنہیں دل کا حال قطعاً نہیں سنا سکتی تھی۔ اور پھر محض چند لمحوں بعد جیسے ڈرائنگ روم میں بھونچا سا آیا تھا۔ نہ نسیبی سر لیا احتجاج نہ زندگی میں پہلی دفعہ اپنے شوہر کے سامنے کھڑی تھیں۔ آج ان کی آواز کی گونج اور تڑپ ہی اور تھی کیونکہ وہ ایک مل تھیں جو بچی کی دل آشنا تھیں۔

اس جی نکار سے گھر آکر عانکہ ڈرائنگ روم سے باہر نکل کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور پھر دیوار سے کمر نیکے ہی اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کے آئیڈل والد کس قدر خاندانی زعم میں مبتلا ہیں۔ اندر وہ نہ نسیبی اسے کچھ ایسا ہی بولے تھے کہ۔

”کسی بھول میں مت رہے گا بے وقوف خاتون۔ آپ کو بیاہ لائے تھے کہ اول تو مجبوری تھی کہ آپ اہل جان کی پسند تھیں اور ہم ان کی کوئی بات رو نہیں کرتے تھے اور پھر ہمیں اپنے خاندان کی کچھ خبر خبر نہ تھی۔ ورنہ ہمارے ہاں ملاوٹ زدہ رشتے کب طے پاتے تھے۔ مگر اب کی بار ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دے سگے کسی کو بیاہ کر لانا اور بات تھی۔ اپنی بچی کسی غیر کو دینا قطعاً دوسرا معاملہ ہے۔ نواب خاندان کی جڑیں ابھی تک موجود ہیں ہمارے خونی رشتے انڈیا میں ابھی تک مقیم ہیں۔ یہ سوچ ہی ہمارا سیوا خون پر عمل پیر ہے۔ ایسے میں جب قدرت نے ہمیں ایک نادر موقع فراہم کیا ہے کہ پھڑپھڑے پھر سے مل سکیں تو ہم کم از کم اتنے بے وقوف نہیں ہیں خونی

پورے گھرانے کو نحوست زدہ چپ نے ڈس لیا۔ برکت اللہ نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے جانے سے صاف منع کر دیا۔ جمل کلم کے ہمارے رک گمیا۔ اس سے جموٹا جمل مست ملنگ تھا۔ اپنے حال میں گم اور خود ہی میں مگن۔ ہاجہ نے چھوٹے لڑکے جیل اور فوزیہ کو ساتھ لیا اور چرے پہ ظاہری بشارت لیے حسنین خان کی کوٹھی پہنچ گئیں جو دلہن کے طلاقی زیورات کی مانند جگہ گاری تھی۔ کتنی ہی دیر باجرہ عانثہ کو ساتھ لگائے کھڑی رہیں۔ اس کا سنا سنورا جھنگا تاروپ آنکھوں کے رستے دل میں اتارتی رہیں۔ نواب حسنین احمد خان کو برکت اللہ کے نہ آنے کا دکھ تھا مگر ظاہر نہ کیا۔

بارات آئی اور سب کے سروں پر حیرت کا ہاراز ٹوٹ پڑا۔ بارات دو دہائے بغیر تھی۔ سب کے سب گویا سکتے میں چلے گئے سوائے نواب حسنین احمد خان کے۔ کیونکہ انہیں بارات کے پہنچنے سے محض پینتالیس منٹ پہلے نواب تھیرک حسن خان کا فون موصول ہوا تھا۔ جس میں انہوں نے بڑی لجاجت اور معذرت کے ساتھ نواب حسنین احمد خان کو بتایا تھا کہ وہ اور چیدہ چیدہ باراتی خیر و عافیت سے دو دن سے اس ہوٹل میں مقیم ہیں جہاں کی بنگ نواب حسنین احمد خان نے خاص مہمانوں کے لیے کرائی تھی۔ مگر ان کے ساتھ ان کے بیٹے طلال خان نہیں ہیں۔ جو شدید خرابی طبیعت کے باعث ہمراہ نہیں بیماری کی وجہ ٹائیفائیڈ بتائی گئی۔ جو بگڑ چکا تھا مگر اب بفضل خدا نواب زاہد طلال بہتری کی جانب گامزن تھے۔ مگر ڈاکٹرز کے مطابق انہیں کسی بھی صورت سفر نہیں کرنا ورنہ حالت خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ اب محض پون مہینہ پہلے پیدا ہونے والی اس صورت حال پر نواب حسنین خان دم بخود تھے۔ یعنی بارات نہیں آ رہی تھی۔ شادی کی نسل۔ بیٹکڑوں مہمل۔ اور جو سینہ ٹھوکر کر کما تھا کہ نوابوں میں لڑکی دیں گے اس کا کیا۔؟

نئی فون کل شروع نواب تھیرک حسن خان کی

البتجائیہ آواز سے ہوئی تھی مگر اس کا اختتام نواب حسنین احمد خان کی منت سامعت پر ہوا۔ عزت پہ بن آئی تھی۔ بیٹی داؤ پر لگ جاتی بھٹل۔ نواب تھیرک حسنین خان نے اس صورت حال کو بڑی مہارت سے اپنے حق میں کیا۔ ایسا مشورہ دیا کہ چند گھنٹوں کے لیے تو نواب حسنین احمد خان کی بولتی بند ہو گئی۔ مگر یہ وہی خیال کہ گھر بھر اڑا ہے ان کا اتوالی طعنہ دیکھنے کو۔ مانتے ہی بنی۔ اور طے یہ پایا کہ نواب زاوی عانثہ کو بغیر نکاح کے رخصت کر دیا جائے۔ اور انڈیا پہنچے ہی باقاعدہ نکاح منعقد کیا جائے کہ لڑکا لڑکی دونوں ہمراہ تو ہوں گے۔ نواب زاوی عانثہ کے ہمراہ ان کی نخیال سے جو بھی چند سمجھ دار بھیل چلنا چاہیں۔ بعد شوق! تاکہ کسی قسم کا واہمہ نہ رہے۔

کمال ہوا کہ نواب حسنین احمد خان مان گئے اور ستم یہ ہوا کہ بیٹی کو رخصت بھی کر دیا۔ ہاں دہائیاں دینی عیش کھا گئیں، خلا میں روٹی بھائی کے ہمراہ ہوئیں کہ دل غم سے بھر گیا تھا۔ رخصتی کا یہ انداز دیکھ کر۔! بھائی لگ بیٹھایا سا گھوم رہا تھا۔ مگر کچھ نہیں سکتا تھا۔ مہمانوں نے خوب چہ بیگوئیاں کیں مگر بارات کے ہمراہ آئی بری اور دیگر لوازمات۔ اللہ اللہ! کیا سونا تھا اور کیا چاندی۔ گویا تھاوں میں سورج اور چاند اتر آئے تھے۔ تمام مہمانوں کو سونے اور چاندنی کے کئے پیش کئے گئے۔ بارات کے ہمراہ آئی ”لماؤں“ نے اس ٹھمٹھاتی سے بری دکھائی کہ سب کی شہ گم ہو گئی۔ مضمیوں میں دبے سونے اور چاندی کے سکوں کی سختی محسوس کرنے کے بعد بھلا کسی کا دل نرم کیوں رہتا۔ سب ہی نے اس عقل مندانہ فیصلے پہ نواب حسنین احمد خان کو شاباشی دی۔ اور نہیں تو کیا۔ اتنی دور سے بارات آئی تو کیا بلا عذر واپس لوٹا دیتے۔ ایک لڑکا ہی تو نہیں ہے بل ہمراہ۔ بلی کیا نہیں ہے؟

عانثہ پھر آنکھیں اور جلد جذبات لیے بن بیانی انڈیا سدھاری چیتے رہ گئیں نہ نوب بی کی نیر مانی

آنکھیں اور ہار کے کھوکھلے دلا سے۔ اجملاہ کمال
اس دھوم سے بارات لے کر آسکتی تھیں۔ ہاں گو ہر
غلاب تو ان کا جمل تھا جس کی پرکھ نواب حسین احمد
خان نہیں کر سکے تھے۔ کیوں کہ وہ جوہری نہیں
تھے!

ہندوستان پہنچ کر جس سلیقے قرینے سے محل نما
حوٹلی میں نواب زادہ عايشہ کا استقبال ہوا۔ اس نے
ساتھ آئی دونوں خلائوں کی کھولن کو قدرے دہلایا
تھا۔!

نواب زادہ عايشہ کے خوب صورت نقشہ اور
انتہائی نفیس دیوان پہ بیٹھنے کی دیر تھی۔ نواب تہرک
حسن خان مولوی صاحب اور اپنے لڑکے کے ہمراہ پہنچ
گئے۔ نواب زادہ طلال حسن خان کو ساتھ بٹھا دیا گیا
اور لپک جھپک نکاح کی کارروائی شروع ہو کر ختم بھی
ہو گئی۔ عايشہ تو کیا محسوس کرتیں کہ ان کی کیفیت سرد
خانے میں بڑی بخت لاش جیسی تھی۔ مگر خلائوں
نے محسوس کیا کہ لڑکے کی آنکھیں ماتھے پر دھری
ہیں۔ نہ سلام کا جواب۔ نہ چہرے پہ آسودگی۔!
عجب سی چلن دکھاتا تھا نواب زادے کا۔ اور پھر اگلے چند
دن نواب تہرک حسن خان صاحب اور ان کی بیگم نے
اس سہارے دونوں کو مصروف رکھا کہ واپسی کی گھڑی
آگئی اور وہ لاگھڑی اپنی بھانجی کے ساتھ تھالی میں نہ
بیٹھ سکیں۔

اتنے تحائف ہمراہ کئے گئے کہ سانسیں بو جمل
ہو گئیں اور اسی طرز پر بھانجی اللہ کے حوالے کئے خود
پاکستان پہنچ گئیں۔ اور حرمین کو سوائے شہن و شوکت
کے قصوں کے۔ سانے کو اور کچھ بھی نہ تھا۔ ایک
نواب حسین احمد خان تھے جو سرخرو سے پھرتے
تھے۔ مگر نہ بیگم تو جیسے سر کے بل انگاروں پہ دھری
تھیں۔

ایک ماہ گزر گیا۔ دوسرا بھی بیت گیا۔ جب
تیسرے مہینے بھی نواب زادہ عايشہ کی کوئی خبر نہ آئی

تو تب نواب حسین احمد خان کا مدلع جمنیلا یا تھا۔
ٹھنک تو وہ پہلے مہینے ہی گئے تھے کہ جب بار بار فون
کرنے پر بھی پتا چلا کہ عايشہ کبھی طلال خان کے ہمراہ
گر میاں گزار نے کشمیر گئی ہیں تو کبھی یورپ کی سیر کی
خبر کلن میں ڈال کر وہاں سے فون بند ہو جاتا۔ بل کے
دل کو غصے لگے۔ روز بت کر دائیں بات کر دائیں کی
بیچ چکی تھیں۔ مگر نواب حسین احمد خان بیوی کی
بات کیا کر داتے خود ان کا تہرک حسن خان سے رابطہ
نہیں ہو پا رہا تھا۔ فون کیسے خط لکھے مگر سب بے
سود رہا۔ راتوں کی نیند صبح معطل میں اب حرام ہوئی
تھی۔ ایسا بھی کیا کہ بی بی بل باب کو تو از سانے سے بھی
مگنی۔ ہوتے ہوتے چھ ماہ ہونے کو آئے تھے۔ نہ نوب
بی نے ایک دفعہ فون کیا تو نواب تہرک حسن خان کی
محل نما حوٹلی کی ایک پرانی بلانے د باتیں کر کے ٹھک
سے فون بند کیا تھا۔ پہلی تو نہیں یاد تھی مگر دوسری
بات سن کر نہ نوب بی کی آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا۔

”نواب زادہ عايشہ امید سے ہیں۔ بڑی حضور
انہیں لے کر کسی محنت افزا پھاڑی مقام کی طرف کوچ
فرما چکی ہیں۔“

کیسی بے بسی تھی۔ کیسی کم مائیگی! بی بی کی پہلی
خوشی اور بی بی سے اتنی دوسر۔ اور اب تو یہ خبر بھی پرانی
ہو گئی تھی۔ اس حساب سے عايشہ کو اب ساتواں لگا
تھا۔ اور اسی پریشانی کو لے کر وہ اپنی طبیعت خراب کر
بیٹھی تھیں۔ نواب حسین احمد خان نے جب بیوی کو
یوں بے سدھ بستر پر پڑے دکھا تو صبح معطل میں

ہر کارے دوڑا دیئے۔ نیت ان کی اپنے لیے تھی کہ آج
کل میں کسی بھی طرح وہ خود اغوا ہو جائیں۔ پہلے تو
کتنے ماہ مہر کیے بیٹھے رہے تھے اور اب بیگم کو اس
حال میں چھوڑ کر جانے سے قاصر تھے۔ جو بھی تھا اس
ساری صورت حال کے ذمے دار وہ خود تھے۔ اب جبکہ
حالات اتنے سنگین ہو چکے تھے تو کوئی وجہ نہیں رہ گئی
تھی کہ وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بی بی کی خیر خبر کا انتظار
کرتے نہ جانے کس کس ذریعے سے وہاں کے چند
جاننے والوں کو حالات بتلائے اور بی بی کی خیریت پتا کر

کے بتانے کو کہا۔

ابھی کسی بھی ذریعے سے کوئی خبر کی خبر کل نہ پڑی تھی کہ ایک دن اچانک نواب حسین احمد خان کو اسماعیل کوچوان کی کل موصول ہوئی۔ کئی پہل تو دونوں سمتوں پر ایک دوسرے کی سائیس سنتے اور محسوس کرتے رہے۔ ایک فلم سی تھی جو حسین احمد خان کی آنکھوں کے آگے چل پڑی تھی۔ کیسی کیسی یادیں نہیں پڑی تھیں بھلا اور کیسی کیسی دکائیں نہیں وابستہ تھیں اسماعیل کوچوان کی وفاداری کے ساتھ۔ اور آج نہ صرف وہ زندہ تھا بلکہ وہ اسے سن رہا ہے۔

نواب حسین احمد خان کو یہ نادر موقع قدرت نے فراہم کیا تھا جب ہی احوال جاننے کے بعد وہ فوراً مدد پر آگئے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ عائشہ کے بارے میں کوئی تفصیل بتاتے۔ خود اسماعیل نے یہ کہہ کر کہ وہ نواب زاوی عائشہ کے حوالے سے کچھ ضروری معلومات فراہم کرنا چاہتا ہے۔ اسے بڑی بھاگا دوڑی کے بعد یہ بمبر حاصل ہوا تھا۔ نواب حسین احمد خان کا پہل میں جیسے خون خچر سا گیا۔ وہ رعشہ زدہ مریض کی طرح پھر پھڑپھڑاتے جاتے تھے۔ اور پھر اسماعیل کی بتائی باتوں نے جیسے انہیں کانٹے دار جھاڑیوں میں گھسٹ لیا تھا۔ ان کا فخر۔ ان کا مان و غرور سب کچھ جیسے ان ہی کانٹوں سے الجھ کر کٹ پھٹ گیا۔ کتنا طنطنہ تھا ان کے لوبی خون میں۔ اور آج ان ہی کے خاندان نے ان کی تکی سی نازک بیٹی کو رول کر رکھ دیا تھا۔

اسماعیل کوچوان نے بتایا کہ عائشہ کے شوہر طلال خان نیم پاگل ہیں۔ انہیں بڑی شدید نوعیت کے دورے پڑتے تھے۔ جو کئی کئی دن تک ان کی حالت خراب رہے رکھتے تھے۔ شادی کے موقع پر طلال خان کو کوئی ٹائی فائڈ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ان دنوں بھی ان کو شدید دودھ پڑا تھا اور ایسی حالت میں وہ خود اپنے لیے وہیل بن جاتے تھے۔ بھلا بارات کے ہمراہ کیسے لے کے جایا جاتا۔ اسی لیے نواب حیرت حسن خان نے

موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چل چلی اور بارات پہنچنے سے پون گھنٹہ پہلے فون کر کے نواب حسین احمد خان کے حواس تحمل کیسے عزت و اہم جاننے کی خاطر حسین احمد خان نے وہی کیا جو ان کی جگہ۔ کوئی بھی ہوتا تو کرتا۔

اور عائشہ کو ایذا پہنچنے ہی سے منع کا موقع دینے بغیر فوراً طلال خان کے ہمراہ نکاح پڑھا دیا گیا۔ اس وقت بھی طلال خان یہ تشنگی کی کیفیت طاری تھی۔ اور اس سے پہلے کہ ساتھ آئی عائشہ کی خلا میں ٹھنکتیں۔ انہیں فوراً کمرے میں بھیج دیا گیا۔ جب تک مہمان حویلی میں رہے، عائشہ کو کسی صورت بھی طلال خان کے کمرے میں نہ بھیجا گیا کہ طلال خان لازمی دورے کی حالت میں سامنے والے کو نقصان پہنچاتے تھے۔

مختلف رسموں کے بہانے سب کو بے وقوف بنایا جاتا رہا اور پھر جوں ہی مہمان رخصت ہوئے عائشہ کو طلال خان کی سپردگی میں دے دیا گیا۔ حالانکہ اس دن تک وہ کافی بہتر ہو چکا تھا۔ مگر عائشہ کے کمرے میں جانے کے محض دس منٹ بعد ہی سارے میں یہ خبر پھیل گئی کہ طلال خان نے نواب زاوی عائشہ خان کا سر پکڑ کر سائڈ ٹیبل کے کونے سے دے مارا تھا۔ سر پھٹ گیا اور کئی ٹکٹے بھی آئے۔ عائشہ خان کی آنکھوں میں پھیلی سر اسٹگی کو نظر انداز کر کے معاملہ رفع دفع کروا گیا۔ اور پھر جیسے کھاتہ ہی کھل گیا!

روز طلال خان عائشہ کے پھول سے وجود پر پھر بار کر اپنے پاگل پن کا ترنہ سجا رہا۔ دن کے کسی حصے میں وہ تارل بھی ہوتا تھا اور کبھی کبھی کئی دن تک انسانیت کے جانے میں رہتا۔ مگر پھر کوئی ہلکی سی ناگواری سب کچھ اکھاڑ بچھاڑ کر رکھ دیتی اور دونوں آبی توہیں باپ سے ہزاروں میل کی دوری پہ اپنی بے بسی پہ سکتی عائشہ!

اور اب جب کہ عائشہ پورے دنوں سے تھی۔ طلال خان کو طلال آیا اور سب سے اوپری میز می پہ کسی کلام سے لاما کو آواز دیتی۔ ذرا سا پیچے کو جھکی۔

پھرتے تھے۔ مگر بچے میں ہندو خان غراتا شیر! کوئی سراپا تھ نہیں آتا تھا۔ محض ایک اسٹیل کوچوان سے لمحے لمحے کی خبر لیتے اور بلا ہی بلا اپنے ہندوستان جانے کے انتظامات کرتے رہے۔ اسٹیل کوچوان کا بیٹا نواب گھرانے کا ڈرائیور تھا اور ہوبو بھی اندرون خانہ فرائض سرانجام دیتی تھی۔ لہذا اندر کی ساری خبریں نواب حسنین احمد خان تک پہنچ رہی تھیں۔

اور جس دن حسنین احمد خان کے ہندوستان جانے کے انتظامات مکمل ہوئے۔ اسی دن عائشہ کے ہل بیٹا ہونے کی اطلاع ملی اور محض اٹھارہ منٹ بعد عائشہ کے مرنے کی اطلاع مل گئی۔ چاروں شانے چت ہوئے تھے نواب حسنین احمد خان! خاندانی وقار۔ نوابی شرافت و نجابت ہر چیز فشتہ محل سال خوردہ عمارت کی مانند نہیں ہوس ہوئی تھی۔ نہ سب بی بد خواص ہوئی اونچے اونچے کوٹے دیقی تھیں اور شائق لال مہنی آنکھوں میں دکھ و تأسف سموئے باپ پہ نظر ڈال کر سر جھکا لیتے تھے۔

نواب حسنین احمد خان اسی دم ہندوستان کے لیے نکلنا چاہتے تھے مگر اسٹیل کوچوان سے بات ہوئی تو اس نے فوراً روک دیا۔

اس کا کہا بھی بجا کہ ”آپ کو حویلی سے کوسوں دور ہی نواب صاحب کے گھر گئے روک لیں گے۔ علاقے کی حدود میں بھی شاید نہ داخل ہونے دیا جائے کہ نواب تہرک حسن خان نے حفظ مائتدیم کے طور پر سارے علاقے میں اپنے پالتو کھڑے کر رکھے ہیں۔ حسنین احمد خان سن ہوئے تو اس کے ہر لہو پیٹھے کے پیٹھے رہ گئے۔ معلوم نہیں کہ کب کی دشمنی بھائی تھی تہرک حسن خان سے! ایسا کیا تھا انہوں نے جس کی سزا لاد کے کھاؤ کی صورت انہیں دی گئی تھی۔

اب انہیں ایک ہی ضد تھی۔ نواب زاوی عائشہ کا بچہ کسی طرح ان تک پہنچ جائے۔ ان کی بیٹی کی آخری نشانی! اور اس کے لیے وہ کوئی بھی قیمت لودا کرنے کو تیار تھے۔ جس جس کی منت ترلہ کرنا پڑا!

ڈھیلے انداز میں کھڑی عائشہ کو دکھا دے دیا۔ ایک چچ تک نہ پھوٹی اور وہ لڑھکتی ہوئی فرش پہ آ رہی۔ پوری حویلی میں وہ قیامت مچی کہ اللہ کاشفہ فی الفور اپتل لے لے جایا گیا۔ اصل فکر بچے کی تھی کہ وہ بچ جائے۔ لہذا نواب تہرک حسن خان اور ان کی نواب بیگم نے ڈاکٹر کے آگے موٹی رقم پیش کی اور سختی سے تنبیہ کر دی کہ اگر کوئی ایسی صورت حال درپیش ہو جس میں بچہ یا بچے میں سے کسی ایک کو بچایا جاسکا ہو تو صرف بچے کو بچایا جائے۔ شام پڑنے سے پہلے ڈاکٹر نے بچے کے محفوظ ہونے کی اطلاع دے دی تھی مگر عائشہ دلچ بہ چوٹ لگنے کے باعث کوسے میں جا چکی تھی۔

نواب صاحب اور بیگم نواب کے سینوں سے ٹھنڈی سانس خارج ہوئیں کہ بیوکم از کم کسی کو کچھ بھی بتانے کے قاتل نہیں رہی تھی ورنہ پولیس کو دے سکتی تھی بچ میں! دونوں میاں بیوی نے بے حد اصرار کیا کہ قبل از وقت آپریشن کے ذریعے بچے کی پیدائش کو ممکن بنایا جائے مگر ڈاکٹر کے حتمی انکار کے بعد ٹھنڈے ہو کر بیٹھ رہے کہ اس طرح سے مل تو مرنی ہی بچہ بھی نہ بچتا۔

اور اب صورت حال یہ تھی کہ عائشہ لاوارث اسپتال میں بے جان مٹی کی صورت بنی پڑی تھی۔ صرف ایک پرانی ملا تھی جو پٹی سے لگی سیوا کر رہی تھی۔

نواب حسنین احمد خان دیواروں سے ٹکرس مار مار کر بھی روتے تب بھی اس نقصان کا زوالہ نہیں کر سکتے تھے جو عائشہ کی شادی کی صورت میں انہیں ہو چکا تھا۔ عائشہ کو واپس پاکستان کیسے لایا جاسکتا تھا۔ اور پیدائش کو کس ممکن طریقے سے پاکستان میں عمل میں لایا جاتا یہ سب کچھ ناممکنات میں سے محسوس ہوتا تھا۔

ان کے خاندان والے اس قدر بدظنیت ثابت ہوئے تھے کہ عائشہ۔ کامرہ بھی شاید ان کے حوالے نہ کرتے۔ بچے کی تو وہ خوشبو بھی ڈھانپ دیتے! ان دنوں حسنین احمد خان پھرے شیر کی مانند

کیا۔ جس کسی کا تعلق واسطہ ڈالنا پڑا۔ ڈالا۔ اسی قبل خوارمی میں عائشہ کا چہلم بھی بیت گیا اور دکھ کی انتہا تو یہ بھی کہ حسین احمد خان کو تیرک حسن خان کا ایک فون بھی نہیں گیا۔ یہاں تک کہ ان کی بیٹی کی موت کی اطلاع بھی نہیں دی گئی۔ اپنے تئیں انہوں نے اس خبر کو سنے میں باپ سے بھی راز میں رکھا تھا۔ یہ تو اسماعیل کو جو ان کا دم تھا جس نے لمبے لمبے انہیں باخبر رکھا اور نہ وہ لوگ اس کی بخشش کی دعا میں کرنے کے بجائے۔ صحت و سلامتی کے لیے نہیں مان رہے ہوتے۔

اب بھی جب نواب حسین احمد خان ہر طرف سے ہاوس ہو چلے تھے تو اسماعیل کو جو ان اپنی جان داؤ پر لگا کے وفاداری کا آخری ثبوت دینے سینہ ٹھونک کر کے میدان میں اتر آیا۔ کراچی میں اسماعیل کے کچھ رشتے دار رہتے تھے جن کی بی بی ہندوستان میں بیانی گئی تھی اور اس کی شادی اسماعیل کے میرے بھائی کے پوتے سے ہوئی تھی۔ اور یہ لوگ ہندوستان میں آس پاس ہی رہتے تھے۔ اسماعیل جانتا تھا کہ وہ لڑکی کھلیہ آج کل میں پاکستان کے لیے نکلنے والی ہے۔ جہاں اس نے اپنے میکے میں کم از کم ایک ڈیڑھ ماہ قیام تو لازمی کرنا تھا۔ ایسے میں یہ قدرت کی طرف سے عطا کردہ ایک سنہری تھیل تھی۔ اسماعیل نے اپنے گھر والوں اور کھلیہ اور اس کے شوہر کو گھراٹھا کیا۔ سر سے پکڑا مار کر اس کے بل کھول دیے اور کئے مکھن کے فرش پر پھینک دیا۔ گریبان بھاڑا اور پچسکڑا مار کر وہیں بچے مکھن میں بیٹھ کر خاک مٹھیوں میں بھر کر سفید سر اور داڑھی میں جمو کی۔ اور سارا مسئلہ اپنے گھر والوں کھلیہ اور اس کے گھر والے کو کہہ سنایا۔ سب ہی فکر فکر ایک دوسرے کی مشکلیں دیکھنے لگے اور بابے اسماعیل کو ہونٹ بنے دیکھے گئے جو بچوں کی طرح اہنٹھا پڑا تھا کہ یہاں سے تب ہی اٹھے گا جب اس کے سر سے فرض کا یہ فرض اترے سو گرنہ ہمیں اسے لڑھا کھود کے دفنایا جائے۔ نواب تیرک حسن خان کوئی چھوٹا نام نہیں تھا۔ ان کے گھر سے بچہ اٹھا اور پھر پاکستان

پہنچانا ایسے ہی تھا جیسے گدھا گاڑی پہ بیٹھا مزور خواہش کرے کہ اس کی گاڑی اڑن کھنولان جائے اور وہ چاند پہ پہنچ جائے۔ سب سے پہلی حالت خود بابے اسماعیل کی ہوس کی تھی کہ بچہ اسی کو لانا تھا۔ بچہ اسماعیل۔ خوب ڈرایا مگر پاپاس سے مس نہ ہوا بلکہ گریہ کر کے حالت بگڑنے لگی تو سب سے پہلے کھلیہ اور اس کے شوہر نے ہی ہائی بھری۔

اور پھر ٹھیک بیس گھنٹے بعد وہ بچہ بخیر و عافیت کھلیہ کے ساتھ پاکستان کو جانے والی ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ کس طرح سے وہ سوار ہوئی تھی۔ کیسے کیسے پورے اس نے ڈر کے مارے اوڑھ رکھے تھے۔ یہ سوچنا بھی محال تھا۔ پیچھے کیا بیت رہی تھی اس کا پتا اب اسے پاکستان پہنچ کر ہی چلنا تھا جبکہ ہندوستان اپنے شوہر کو فون کرتی۔

جس دن وہ بچہ کھلیہ نے نواب حسین احمد خان کے حوالے کیا، اسی دن صبح صبح اسماعیل کو جو ان کی وفات کی اطلاع آئی۔ باقی پیچھے سب خیریت رہی تھی۔ بچے کی خوب ڈھنڈائی تھی مگر اسماعیل کی موت نے سب کا دھیان اس کے گھر سے ہٹا دیا تھا۔ پورے علاقے کو گھیرے میں لیا جا چکا تھا۔ پورے دیش کو کھنگالا جانا شروع کر دیا گیا تھا۔ اسماعیل کو جو ان جان وے کر اپنے گھر والوں کو بچا لیا اور جاتے جاتے نواب حسین احمد خان کو اپنی نمک حلائی کا ثبوت دے گیا۔

نواب حسین احمد خان نے اس بچے کو گویا کہ اور سمجھ لیا۔ جس کی حفاظت کی خاطر وہ ساری ساری رات جاگتے اور سارا سارا دن چوکس رہتے۔ ذرا بیمار پڑے تو برکت اللہ اور حاجہ آکر زینب بی اور اس بچے کو بڑے مان کے ساتھ اپنے پنڈے لے گئے۔ تاکہ اگر خدا آخواست کوئی اور کارخ کرے تو بچہ نہ ملے اور یہی اچھا ہوا کیونکہ جس دن زینب بی اور بچہ گاؤں گئے اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد نواب تیرک حسن خان خود جتھالے کر ان کے گھر موجود تھے۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ شارق گھر پر تھا اس نے فون کر کے پولیس کو بلوایا اور پھر بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ بہر حال ایک

پچھے ہی پیدا ہوئے تھے۔ تھوڑی چھوٹائی بڑائی کے ساتھ تقریباً ہم عمر ہونے کی وجہ سے تینوں اکٹھے ہی پائے جاتے تھے۔ اجمل اور جمیل کو برکت اللہ اور حاجہ نے اکٹھے ہی منٹلایا تھا۔ سب سے چھوٹا شادی کے بعد کے باہر گیا تو کچھ عرصے بعد بیوی کو بھی بلوایا۔ یوں وہیں کا ہو رہا۔

نواب حسین احمد خان کے دل کا مال بڑھتا تھا۔ جب جب جیل کو دیکھتے۔ ان کی ایک ہٹ دھرمی نے ان کی بیٹی کی جان لے لی تھی۔ کہے کیسے نہ سمجھنا تھا برکت اللہ نے انہیں۔ اور کس کس طرح سے بے عزتی نہیں کی تھی حسین احمد خان نے اپنے یار کی۔ یہ سب یاد آتا تو دلوں رواں سلگنے لگتا۔ ان کے بدترین رویے نے دوستی میں دراڑ ڈال دی تھی۔ اور اب حسین احمد خان دل سے چاہتے تھے کہ اس خلا کو پر کیا جائے جو ان دیکھا ہونے کے باوجود صاف کھائی دیتا تھا۔

اب کی بار پھر انہوں نے وہی غلطی دہرا دی جس کا ماضی قریب میں وہ بدترین انجام دیکھ چکے تھے۔ بہت چاڑ اور امدان سے وہ اور نہ نپ لی، فوزیہ اور شارق کی بات ٹھہرا کر آئے تھے۔ بڑا بھاری ٹنگن، نہ نپ لی نے فوزیہ کے ہاتھ پر دھرا تھا۔ برکت اللہ اور حاجہ کا بس نہ چلتا تھا کہ کھل کا قالین بٹا کر حسین احمد خان کے پیروں میں بچھا دیں۔ مگر ہوا کیا؟

واپس آئے۔ اُسکے چہرے اور مسکے وجود کو شارق معمولی سا ٹھٹکے مگر جتنا اس وقت لگا جب انہیں یہ پتا چلا کہ ان کی فوزیہ کے ساتھ بات بچی کر دی گئی ہے۔ کوئی مدد نہ سادہ تھا۔ نواب زادہ شارق خان کو ایک نیم کنوار اور بچی و ساتن کے پلے پاندھ دیا جائے اور وہ ایسا ہو جانے دیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کھٹک کے باوجود نواب تیرک حسن خان کو یہ یقین بھی ہو گیا کہ ان کا پوتا یہاں نہیں۔ حالات و شواہد حسین احمد خان کے حق میں جاتے تھے۔ وہ چلو کر بھی ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں ملت ہو گئی تھی۔ ان کا پوتا۔ ان کی نسل کو کوئی ان کی ناک کے نیچے سے لے کر نکل گیا اور وہ ہاتھ ملتے رہ گئے۔

نواب زادی عائشہ کے صدمے کی صورت جو چوٹ نواب حسین احمد خان کے دل پر پڑی تھی۔ وہی ہی کاری ضرب انہوں نے تیرک حسن خان کے دل کو لگائی تھی۔ اور یوں یہ باب ہمیں پریشہ کے لیے بند ہو گیا۔

مزید کچھ عرصہ گاؤں میں گزار کر نہ نپ لی بیچ سمیت واپس آئیں اور پھر بھر پور لاڈ و احتیاط کے ساتھ نواب زادہ احرار حسن خان نواب حسین احمد خان کی کوٹھی میں پلنے لگا۔

عائشہ کا غم بھلائے نہیں بھول سکتا تھا۔ یہ دکھ کئی دلوں کا سوراخ بن چکا تھا جو سدا رہتا تھا۔ کبھی کبھار نہیں جیتی تھی۔ جمل کا دل بھی اسی فرست میں تھا جس پر آج بھی وہ پری پری کھلتی تھی۔ وہ عائشہ کو دانستہ بھی بھلا نہ پائے اور احرار اسی عائشہ کی نشانی تھا۔ جس سے انہیں بے طرح انیت اور لگاؤ تھا۔ گو کہ اب وہ خود بھی شادی شدہ تھے۔ ان کی بیوی ایک سدھی سادی وفا شعار سی لڑکی تھی۔ مگر وہ جتنوں کو دیکھ کر جھپٹی نہیں تھی۔ اس کے لیے میں اوس نہیں مسمکتی تھی۔ یہ تو عائشہ کے اوصاف تھے۔ اور وہ اب کہیں نہیں تھی۔

گزرتے وقت نے عائشہ کے نقوش مٹائے تو نہیں تھے مگر دھندلا ضرور دیے تھے۔ اس سانچے نے برکت اللہ اور حسین احمد خان کو ایک دفعہ پھر قریب کر دیا تھا۔

جمل کی شادی عائشہ کی شادی کے تین ماہ بعد ہی ہو گئی تھی۔ ان کے دونوں لڑکے احرار کے آگے

اس وقت حسین احمد خان کو وہ بالکل اپنا پر تو لگے تھے۔ کسی ہی شناخت، وہی ذات اور سل کا غور ان کے پورے وجود میں بول رہا تھا۔ حسین احمد خان نے اسی وقت چہرہ اتارنا جگایا کہ شاید سینے سے جلاگا ہو۔ انہیں کوئی ہماڑے دھکا دے دیتا تو شاید اتنی اذیت نہ ہوتی جتنی شرمندگی کا وہ ہماڑ سر کرنے میں ہوئی تھی۔ کس طرح اور کن لفظوں میں انہوں نے برکت اللہ کو ”نہ“ کہا تھا۔ انہیں کچھ یاد نہیں تھا۔ بس شل حواسوں سے جو منظر دیکھا تھا وہی نظروں میں بس گیا۔

برکت اللہ کا ان پہ بے تحاشا چہرہ چلا نا۔ انہیں دھکے دینا اور ہر طرح کا مرنے جینے کا تعلق ختم کرنے کا اعلان کرنا۔ اس کے بعد اور اس سے پہلے حسین احمد خان کی یادداشت میں کچھ نہیں بھر رہا تھا۔ نواب زادہ شارق سب سلسلے ختم کر کے فرانس سہیل ہو گئے۔ میں کو کبھی کبھار فون پر خیریت بتا دیتے اور بس۔ حسین احمد خان اور زہنبی کی زندگی ان کی طرح احرار کے گرد گھومنے لگی اور وقت بھی آگے بڑھتا گیا۔

کسی نے دوبارہ برکت اللہ کو حسین احمد خان کی چو کھٹ پار کرتے نہیں دیکھا۔ دوستی کے اگلے ورق پر بد اعتمادی کی کالی سیاہی نے انٹ داغ چھوڑ دیے تھے۔ کہ وہ ورق ہی پھاڑنا پڑا۔

برکت اللہ کو ایسی ضد چڑھی کہ جس کام میں حسین احمد خان ہاتھ ڈالتے وہیں کوئی نہ کوئی رخنہ اندازی ضرور کرتے۔ دھیرے دھیرے حسین احمد خان کے لیے کاروباری معاملات کو پینڈل کرنا مشکل ہوتا چلا گیا اور آخر کار انہیں اپنا چلتا کاروبار اچھے داموں فروخت کرنا پڑا۔ معقول جائیدادیں خرید کر کرائے پر چڑھائیں اور سکون سے بیٹھ کر کھانے لگے۔ برکت اللہ کی طرف سے کی جانے والی مسلسل جھٹ بازی نے انہیں بھی متفر کر دیا اور یوں ایک سرد گرم جنگ کا آغاز ہو گیا۔ دونوں فریقین کی فوجوں میں گھر کی سپاہ شامل نہیں تھی۔ گھر والے تو ابھی بھی

اسی طرح ملتے تھے۔ جمل اور اجمل نے ہتیرا سمجھایا باپ کو۔ مکران کی پر تالے کی اینٹ وہیں کی وہیں رہی۔ فوزیہ کی شادی ہو گئی۔ بچے بھی ہو گئے مگر کدورت نہ دور ہوئی۔

وقت بدل گیا۔ بچے بڑے ہو گئے اور بڑے بابے بن گئے۔ احرار کی اٹھن غضب کی تھی۔ میں سازہن اور شرارت و بردباری کا استخراج کیسے۔ دل کو موہ لینے والی شخصیت کا مالک احرار جب کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر لائنٹ ہوا تو دھوم کی بج گئی۔ گفتگو میں شرارت اور تاثرات میں سنجیدگی اس کا خاصہ تھی۔ حلقہ احباب میں اپنی خوبیوں کی وجہ سے اہرل عزیز تھا۔

نواب حسین احمد خان کو احرار میں عائشہ دھمتی تھی۔ اس کی ٹانگ اور اس پہ سچا چھوٹا پارک سا تل۔ آنکھوں کی ہلاوت اور ان کا شرقی رنگ ہو سو میں جیسا تھا۔ وجاہت اس نے اپنے باپ کی لی تھی۔ بھلے سے کچھ بھی تھا، طلال خان خوب صورت اور وجہ مروت تھے۔

وقت کے گھوڑے پہ سوار بہت سے گزرے پل کچھ گھاڑ منڈل کر گئے اور کچھ نئے داغ سینوں پہ سجا گئے۔ حسین احمد خان کے لیے تقدیر ایک اور بڑی مات لیے ٹانگ میں تھی۔

شارق نے فرانس میں شادی کر لی تھی۔ چند سال بعد مسلسل فون کر کے میں کو راضی بھی کر لیا اور زہنبی نے کسی نہ کسی طرح حسین احمد خان کے دل میں بھی مچائش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ گو کہ وہ ظاہر نہیں کرتے تھے مگر تھے تو پاب پی۔ ایک اولاد کا تو مرا منہ بھی دیکھنا نفیس نہ ہوا تھا۔ دسرا زندہ ہوتے ہوئے بھی نظروں سے اوجھل تھا۔ کب تک جی کو کڑا کیے رہے۔ اشارے کنائے میں زہنبی سے کہہ دیا کہ شارق کو پاکستان بلا لیں، اگر وہ آتا چاہیں

تھا۔ میں نے جھٹ بیٹے کو فون کر لیا۔ شارق جیسے
انتظار ہی میں تھے۔ اپنے چودہ سال کے بیٹے اور بوی
کے ساتھ پاکستان کے لیے فلائیٹ پکڑ لی۔ لیکن
قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سچے سے محض ایک
مخمسہ قبل کرکٹ ہوئی۔ شارق گئے، چمکتی زندگیاں
نفا میں بکھر گئیں!

نواب حسین احمد خان کے لیے تقدیر کا یہ وار بڑا
کاری تھا۔ شدید پارٹ ٹیک ہوا مگر زندگی بچ گئی۔
انہیں پتا ہوا کہ دوسری اولاد کا بھی مرا مت دیکھنا نصیب
نہیں ہوگا تو کبھی بھی شارق کو نہ بلائے۔ دور
رہے مگر زندہ تو رہے!



احرار کو کہ محض سولہ سال کا لڑکا تھا جس کی بھیجی
مسعی چرے پہ بے حد بھلی محسوس ہوتی۔ چھوٹی
سی عمر میں بھی وہ تانا کے لیے قابل بھروسہ تھا۔ حسین
احمد خان کو اس کی معاملہ فہمی پہ ناز تھا۔ اس کے
مشورے قابل عمل ہوتے تھے۔ مگر کے درود یوار
سے بچتی باجی خاموشی سے گھبرا کر اس نے تانا کو مشورہ
دیا کہ گھر بچ کر کسی کالونی میں شفٹ ہو جائیں۔ یہاں
سے اچھی یادیں وابستہ نہیں ہیں۔ اس کی ماں لور
ماسوں کا کھیلنا بچپن، آنکھوں کے سامنے آنے لگیں
اس سے تانا، مانی نہ چھین لے۔ نواب حسین احمد خان
نے بھی بھلا ڈال دیئے۔ وہ بھی تھک گئے تھے
صدے سے سستے سستے۔ ان کی ماں کی موت ان کی اولاد
کی موت اور ان کی دوستی کی موت سب کا تعلق اس
گھر سے جڑا تھا۔

حسین احمد خان نے اپنے ایک اچھے جاننے والے
کے ذریعے کو بھی بکرا کر پوٹ کالونی میں خوب صورت
گھر خرید لیا۔ یوں اس کو شعی میں بھٹکتے مانی کے
لپکتے انگاروں سے دامن چھڑا کر حسین خان نے یہ
باب ہمیشہ پیش کے لیے بند کر دیا۔

زندگی کچھ سہل ہوئی۔ عم زندہ، دو جوں کو تبدیلی کا
دوڑن نصیب ہوا۔ زندہ رہنے کا جواز نظر آیا۔

حسین احمد خان نے احرار خان کے لیے خود کو پیسے
اتالیق مقرر کر لیا۔ جو کچھ مل اور کیوں ان کے بیٹے
میں رہ گئی تھیں، وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ احرار کی
ذات میں کوئی غلامہ جائے۔ یہی کو روز محشر جواب
تھے۔

لور جب احرار کا ایم فل چل رہا تھا تب ہی ایک روز
صبح اٹھنے پہ معلوم ہوا کہ برکت اللہ صاحب اپنے اہل و
عیال کے ہمراہ ساتھ والے گھر میں شفٹ ہو چکے۔
حسین احمد خان کو یوں خبر ہوئی کہ صبح اخبار پکڑنے
گیٹ کے قریب آئے تو گیٹ کے باہر چارپائی کھینچنے کی
توازی تھی۔ حیرت زدہ ہوئے کہ ابھی تک ارد گرد کے
گھروں سے ایسی توازی نہیں سنی تھی۔ سب ہی
کھاتے بیٹے لوگ تھے۔ چارپائیوں والا سسٹم کس
نظر تو نہیں آیا تھا۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر گیٹ
وا گیا۔ سر باہر نکالا تو پتھر کے ہو گئے جیسے۔ باہر
ساتھ والے گھر سے یہ برکت اللہ دھوٹی کرتا پٹے
چارپائی بچھائے، نکیہ لگائے۔ حقہ گڑ گڑائے جارہے
تھے۔ کچلی کا تار ان پر آڑا تو شاید ایسا اندر وار جھٹکا نہ
کھاتے جیسا ابھی کھایا تھا۔ وہ تو صدے سے جم ہی
گئے جیسے۔ برکت اللہ نے آہٹ پر پلٹ کر دیکھا۔
حسین احمد خان کو دیکھ کر آنکھوں میں عجیب سا تاثر
ابھر کر معدوم ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے بھنوس تن گئیں،
چرے پر استہزائیہ تاثرات دانستہ پیدا کیے گئے۔ لمبا
ساحقے کا شل لیا اور گردن کو قدرے جھکا کر بولے۔

”ہو رہا کو تو تر۔! تیرا گوانڈی (مسلیہ) کن کر گیا
ہوں۔!“ حسین احمد خان سٹپٹا گئے۔ شروع سے
برکت اللہ ان کے گورے رنگ کی وجہ سے انہیں کو تو
کہتے تھے۔ مگر صرف تنہائی میں۔ یہ پہلا موقع تھا
جب سرعام اس نام سے مخاطب کیا گیا۔ حسین احمد
خان نے تیوریاں چڑھائیں اور گرد بھینسی، جھینپی
نظر ڈالی۔ اکا کا ”پٹیک“ تھی کوئی خاص جمع نہیں تھا
سو گردن اکڑا کر ایک غصیلی نگاہ برکت اللہ پہ پھینک کر
واپس اندر ہو لیے۔

اس کے بعد تو چل سو چل۔! ایسی نسل شروع

ہوئی کہ پوری کلاہی واقف ہو گئی کہ برکت اللہ صاحبِ حسین احمد خان کو کیو ترکتے ہیں اور لوہاب حسین احمد خان برکت اللہ کو ”بنا“ کہتے ہیں۔ خود دونوں فریقین کے گھر کے افراد اس بات سے اب واقف ہوئے تھے کہ عمر بچوں کے ہاتھ تو گویا شعل آگیا تھا۔ آپس میں بیٹھے ”کیو ترنا“ اور ”بنا دلوا“ کی خوب تکرار کرتے۔

کچھ بھی تھا۔ دونوں گھرانے کے افراد ایک دوسرے کا ساتھ پا کر بے حد خوش تھے۔ خاص طور پر بچی کو زینب تللی کا دوبارہ ساتھ ملا تھا۔ ان کی تمنا کی کا خوب ازالہ ہوا تھا۔ ذرا گھر کے مرد گھروں سے گئے نہیں یہ دونوں سر جوڑ کر بیٹھ جاتیں۔ خوب ہنستیں، دھنستیں اور ایک دوسرے کو گلے لگا کر نہ جانے کس بات پر تسلی دلا دیتیں۔

جمل صاحب کے دونوں بیٹوں سے احرار کی گاڑی چننے لگی۔ شام ہوتے ہی کبھی احرار تو کبھی اولیس اور عمیس چمت پھلانگ کے انٹھے مل بیٹھتے اور خوب محفل گرم ہوتی۔ جمل صاحب کے برعکس ان کے بیٹوں میں وہ ذہانت اور خوش روئی نہیں تھی جو عمی ان کا خاصہ تھی۔ اور یس نے تو بمشکل بی کام منٹایا تھا اور کاروبار میں کھپ گیا تھا۔ جب کہ عمیس تین سال سے آکٹاکس میں ماسٹر کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا مگر اس سال پھر کلیر نہیں کر سکا تھا۔ شعرو شاعری کا شوقین تھا مگر ذوقِ رقصوں اور نرکوں تک سی محدود تھا۔ سوائے ”مل کی دعا“ جنت کی ہوا کے ہر راہ چلا شعر وہ پاکٹ ڈائری میں نوٹ کرنا فرض سمجھتا تھا۔ اور ڈائری کے سرویق پر بڑی فحاشت و خوب صورتی سے تیل بوٹے بنا کر کے یہ شعر لکھا تھا۔

”مزدان کر۔ دعا کر یا کر۔“

خود بھی بلا کا شوق پایا تھا شاعری کا اور اکثر فی البدیہہ کہتا تھا۔ سوائے میاں جی کے سائے! ایک دفعہ غلطی سے میاں جی پہ شعر کہہ مارا تھا۔ انہوں نے پوتوں کو صحن میں کرکٹ کھیلتے دیکھا تو آگئے درمیان میں ناگ منہ چڑھاتے۔ کرکٹ سے دیے

بھی انہیں ہر تھا، فریقیوں کا کھیل کتے تھے۔ گلی ڈبڑے کے شوقین تھے، پور جی خانے سے دودھ بولنے والی مدھلی منگوائی۔ فرش پہ مار کر اس کا چپو توڑا۔ پیچھے رہ گیا ڈنڈا اور گلی تو ریڈی میڈ ہاتھ میں آئی گئی تھی۔ لڑکوں کو اس کھیل کی افادت میں دو چار باتیں کہیں۔ سب کو جوش چڑھ گیا، ہر کوئی میاں جی سے ضد کرنے لگا کہ اسے سہلا موقع دیا جائے۔ ایسی شاندار ہٹ لگانے کا گلی کو کہ گلی مسکین دوبارہ نظر نہیں آئے گی۔

اولیس صاحب بھی پیش پیش تھے۔ میاں جی اڑ گئے کہ نہیں! ابتداً ان ہی کے ہاتھوں ہو گیا۔ سب کے سب ایک دائرے کی صورت گلی ٹٹلی کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ گونگو میاں کچھ زیادہ ہی قریب تھے۔ جیسے ہی میاں جی نے ڈنڈا ہوا میں اٹھایا ان کی پایا آدم کے زمانے کی ڈوری والی عینک یک دم پھسل کر گلے میں آہڑی۔ موٹے موٹے شیشے تھے، آنکھوں سے اترے تو نظر کیا خاک آتا۔ لے کر ڈنڈا سارا بے چارے گونگو کے سر پہ۔ وہ ہائے وائے کرتا پورے صحن میں ڈکرانے لگا۔ گلی تو بچنے سے بچ گئی مگر گونگو کے سر پر ایک عدد ”گنگا گونگو“ آگ آیا۔ میاں جی نے عینک دوبارہ سٹ کی تو سامنے بے جی بھل میں گونگو کو لیے انہیں گھور رہی تھیں۔ انہوں نے میاں جی کے خوب لتے لیے کہ آخر کو گونگو ان کا سب سے لاڈلا پوتا تھا۔ میاں جی کلن دبائے سنے گئے، پھر جیسے ہی بے جی گونگو کو گلے سے لگائے واپس ہوئے، ٹھیک اسی لمحے ”مال پیلے“ ہوتے میاں جی کے لیے، عمیس کی زبان پھسل پڑی!

پہل گئے کیا کھڑکھڑکائی ہوئی ہے۔

پرانے گئے اب نئے کی باری آئی ہے۔

میاں جی نے آؤ دیکھنا نہ تو ایسا ناگ کے گلی کا نشانہ مارا کہ برابر جا کر عمیس کے جڑے بر لگا۔ اب کے عینک بھی نہیں پھسل گئی لہذا چوکنے کا چانس ہی نہ تھا۔ پورا ہفتہ عمیس بلایا مارا تھا۔ اس کے بعد سے اس نے میاں جی کو شعر سننے کی محنت کبھی

نہیں کی۔ ”ہم م۔! پھر آگے کیا۔؟“ احرار نے بمشکل جھلی روکتے ہوئے ٹلی سے سوال کیا۔ وہ زہنبی کے لطف میں گھسا پختی سے سر نکالتے کب سے بیٹھا جیتے وقت کے قطعے پلٹ رہا تھا۔

”آگے کیا۔ چندا۔ بس دھول ہی اڑ رہی ہے۔“ زہنبی نے اس کے اچھے بال اپنی نازک بوڑھی انگلیوں سے سنوارے۔

”ٹہنی جان۔ چاند کہہ لیا کر س۔ چندا کو لانا مجھ پر ڈیو ہے۔“ بڑی چاہت سے ٹلی کے ہاتھ تھام کر وہ گری سجدگی سے بولا۔ زہنبی نے دھیرے سے دھب لگائی اس کے سر پر۔ پھر ذرا سا جھک کر اس کے مہکتے بالوں سے بھرے سر کو چوم لیا۔ وہ آنسو ایک ساتھ لڑھک کر بالوں میں کھو گئے۔

”تم ہو سوائی مل کا رتو ہو احرار۔ ویسی ہی ریشم کے لمبوں ہی بائیں کرتے ہو۔“ لپٹتے جاؤ وقت کا احساس تک نہیں ہوتا۔

”ہو نم۔! یہ تو آپ کالا ڈیہ ٹلی جان۔ ورنہ ٹا جان فرماتے ہیں کہ مجھ سا خزانہ ان کی پچھلی کئی نسلوں میں نہ گزرا ہو گا۔“ احرار نے دلی مسکراہٹ کے ساتھ آنکھیں میچتے ہوئے جواب دیا۔ زہنبی ایک آرزو سی سانس کھینچتے ہوئے بولیں۔

”تمہارے ٹا ویک زندہ عمارت میں احرار! بنیادوں میں انگڑی ہے ورنہ کب کے ڈھے گئے ہوتے۔ انہیں اپنے کیے گئے غلط فیصلوں پر پچھتاوا ہے۔ وہ اولادیں کھوئی ہیں انہوں نے تم ہی وہ پتوار ہو احرار جو ان کی خستہ حال ناؤ کا رخ بدل سکتے ہو۔ اپنے ٹا کے لیے ایک بار۔ محض ایک بار جتا وقت دہراؤ۔ اب تو چل سو چل ہے۔ اپنے جگری بار کے ساتھ دل کا بار ہلکا کر لیں۔ مل بیٹھیں ایک بار پھر۔!“

وہ آنسوؤں سے دودی تھیں۔ حسنین احمد خان جس طرح ٹوٹے تھے وہ ان کے سامنے تھا۔ اپنا دکھ کسی سے نہیں کہتے تھے۔ صرف ایک برکت اللہ ہی تو

تھے جس سے ان کے دل کو آشنائی تھی۔ وہ دونوں کو ایک دیکھتا چاہتی تھیں۔

”کو شش تو کر رہا ہوں ٹالی جان۔ مسئلہ ٹا جان کا نہیں ہے۔ بننا واد۔ اوہ۔ میرا مطلب برکت واد کا ہے۔“ زہنبی بی کے گھورنے پر اس نے فوراً ”جیلے کو ٹوٹیہ دیا تھا۔“

”اب وہ کب اور کیسے مانیں گے نہ سب قدرت پر چھوڑیں۔ وہ خود بخود سب پیدا کرے گی۔ آپ بس دعا کریں کہ ورنہ ہو۔“

”حرم کیا کہتی ہے۔؟“ زہنبی نے اس سے پوچھا۔

”حرم۔ حرم کا تو دماغ ہر وقت گرم ہی رہتا ہے۔“ احرار نے اپنی خوب صورت ٹاک کو ضرورت سے زیادہ چڑھا کر بولا۔

”ارے ہنم۔ اتنی تو پیاری بچی ہے وہ۔ تم ہی اسے ستاتے ہو۔“ زہنبی نے اس کے کندھے پر ذرا سا دباؤ ڈال کر پرے دھکیلا۔ وہ مزید قریب ہو کر بیٹھ گیا۔

”ہاں جی۔ بالکل بالکل۔ زبان بھی بہت پیاری ہے۔ آرام سے مجھے غصے میں ”کھوتا“ بول دیتی ہے۔“ اس کے طنزاً ”مسکرا کر کہنے پر زہنبی ہونٹوں پر ہاتھ رکھے بے تحاشا نہیں۔ احرار نے بڑے لاڈ سے انہیں دیکھا اور تب تک دیکھا تا جب تک وہ ہنسی روک کر بات کرنے کے قابل نہ ہو گئیں۔ لال انار ہو گئی تھیں وہ۔

”آہستہ بولو احرار۔ تمہارے ٹانے سن لیا تو بے نقط سنائیں گے۔ انہیں پہلے ہی تمہاری زبان بڑھنے کا اندیشہ رہتا ہے۔“

”ارے۔ وہ تو مجھے بار بار کہہ چکے ہیں کہ۔“ برخورداد! آپ کا لب و لہجہ بڑتا جا رہا ہے۔ نو ابوں کی اولاد کم اور موالی زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔“ وہ آواز کو خوب بھاری بھر کم ہٹا کر بولا اور خود ہی تہقہ لگا کر ہنس دیا۔ زہنبی یک ٹک اسے دیکھے گئیں۔ بنا ہلکے جھپکے۔ یہاں تک کہ نمی

آٹھری۔ اور ایک آنسو بے تاب سا ہو کر پکلوں کی باڑھ پھلا نکلتا گل پر لڑھک آیا اور کسی غم زدہ جھری میں گم ہو گیا۔

”تم بالکل عائنہ جیسے دکھتے ہو اور شارق کی طرح شرارتی ہو۔ تم نے میری دونوں اولادوں کا عکس چرائیا احزاب!“

”تو میں اب ہی کی اولاد ہوں نانی جان۔ اپنی ماں اور ماہوں جیسا تمہیں ہوں گا تو کیا برکت دادا جیسا دکھنا چاہیے تھا مجھے۔“ اس نے زہنبی کو ہنسنے کی سعی کی تھی۔ ان کی آنکھ کا آنسو اسے بے چین کر دیتا تھا۔ وہ بہت شکستہ اور بوڑھی ہو چکی تھیں۔

”ارے۔! تمہارے برکت دادا بھی بڑے کڑیل جوان تھے۔“ ان کا دھیان بٹ گیا تو وہ مسکرا کر بولیں۔

”جانے دیں نانی جان۔ بے جی کتنی ہیں کہ وہ مرل تھے۔ کڑیل انہوں نے بنایا۔ خورائیں کھلا کھلا کر۔“

”تو یہ ہے لڑکے۔ کسی کو تو بخش دیا کہ۔ چلو۔ اب اٹھ جاؤ۔ مجھے کچھ آرام کرنے دے۔ چھٹلے کئی ٹکٹوں سے داستان امیر حمزہ سن رہے ہو۔ اپنے نانا کی غیر موجودگی کا خوب فائدہ اٹھایا تم نے آج۔“

زہنبی نے نائیکس پھیلا کر لٹاف برابر کیا اور نیمہ دراز ہوئیں۔ ان کے چہرے سے تھکن ہو رہی تھی۔

انہوں نے احزاب کے بے حد اصرار پر ماضی کے بوسیدہ صفحات سے گرو جھاڑی تھی اور اس گرو میں احزاب نے سونے کے ذرے جیسے چند لمبے کشید کیے تھے۔ ان کی بدوشی میں اسے چند چھڑے ملائے تھے اور کچھ روٹھے منانے تھے۔

سارا دن اس نے بے جی کے ساتھ گزارا تھا اور ان سے ساری کٹھان چنگی بھی اور پھر سن ہوتے سر کے ساتھ بستر ڈھلے کی بھی۔ صورت حال اس کے سوچ اور توجہ سے بڑھ کر سنگین تھی۔ وہ تو بھی تھی کہ میاں جی اور حسنین دادا میں کسی کا دیواری محالے کو لے کر ان بن ہوگی، مگر یہاں تو کئی تختیاں آپس میں جھگڑ رہی تھیں۔ ایک طرف اسے نواب زادی عائنہ کے لیے بے حد رنج تھا تو دوسری طرف۔

بے حد نفیس اور رکھ رکھاؤ والے محل تیار کے لیے دل دکھ کر رہ گیا تھا۔ اک کک سی دونوں کے دل میں دلی رہ گئی۔ بیوں کے غلط فیصلے نے ایک کی زندگی اجاڑ کر رکھ دی تو دوسرے کا دل۔ بچپن سے اوجیز عمری تک ساتھ نبھانے والے دو دوست ایک جھٹکنے کی مار نہ سہ سکے اور ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے۔ وہ میاں جی کو غلط نہیں سمجھ رہی تھی کیونکہ ان کا ماں ٹوٹا تھا۔ ایک بار نہیں۔ دو بار۔ حسنین دادا نے جمل تیار کو رو کیا اور نواب زادہ شارق نے فوزیہ پھپھو کو۔ نتیجے میں جو دوستی۔ رشتے داری سے بڑھ کر تھی وہ ہاتھ جھاڑتی بیچ میں سے نکل گئی اور سرود شنی کو جگہ مل گئی۔ جو آج تک جاری و ساری تھی۔ صرف شدت میں کچھ کمی واقع ہوئی تھی اور اب جو موجودہ صورت حال تھی اس کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے حسنین دادا تھوڑے سے مظلوم دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اپنی دو جوان اولادیں کھو چکے تھے۔ جن کے ہونے کا جھگڑا تھا وہی نہیں رہے تھے۔ صرف ان کا غم مرتے دم تک ان کے ہمراہ تھا تو ایسے میں اس کے خیال میں میاں جی کو نرمی دکھانی چاہیے۔ انہیں اپنے یار کا غم بانٹنا چاہیے۔ نہ جانے کتنا غبار جمع ہو چکا ہو جس کے لیے حسنین دادا کو میاں جی کا کاندھ حادہ کار ہو۔

(باقی آئندہ اہل ان شاء اللہ)

حرم نے آج کالج سے چھٹی کی تھی۔ کسل مندی اس قدر تھی کہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ کالج نہیں جاسکی تھی مگر لاکھ فائل پیپر سر رہے تھے۔ وہ اپنی اسٹوڈنٹس کا حرج ہونا فوراً نہیں کر سکتی تھی مگر کل کا

تقسیم ہند کے فسادات میں گوجرانوالہ کے رہائشی تیرہ سالہ برکت اللہ کے تمام گھر والے کام آگئے تھے۔ صرف اس کی ماں اور وہ بچ گئے۔

ان ہی دنوں لکھنؤ کے نواب خاندان کی ایک بیگم، اپنے وفادار کوچوان اسماعیل کی مدد سے اپنے کم سن بیٹے کے ساتھ جان بچا کر برکت اللہ کے گاؤں پہنچیں۔ جہاں برکت اللہ کی ماں نے انہیں پناہ دی۔ دونوں خواتین اور ان کے بچوں میں دوستی ہو گئی۔ دونوں نے اپنے بچوں کی شادیاں بھی ایک ہی خاندان میں کیں۔ برکت اللہ کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ نواب حسنین خان کے دو بیٹے عانتہ اور شارق تھے۔ عانتہ اور جمال ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے مگر نواب حسنین خان نے نوابی کے زعم میں برکت اللہ کے بیٹے کا رشتہ ٹھکرا کر انڈیا میں مقیم اپنے رشتہ دار نواب تبرک حسن خان کے انتہائی مال دار گھر انے میں عانتہ کی شادی کر دی۔

انڈیا سے بارہت آئی تو دولہا اس میں شامل نہیں تھا۔ بتایا گیا وہ بیمار ہے۔ نکاح لڑکی کو انڈیا لے جا کر کیا گیا۔ عانتہ کا شوہر نیم پاگل تھا جس کا علم نواب صاحب کو نہ ہوسکا۔ عانتہ پاگل شوہر کا تشدد برداشت نہ کر سکی اور ایک بچے کو جنم دے کر چل بسی۔ جسے پھپھایا گیا۔ جب حسنین خان بیٹی سے ملنے انڈیا پہنچے تب انہیں پتا چلا۔ کوچوان اسماعیل نے جان پر کھیل کر نواب صاحب کا نواسا ان تک پہنچا دیا۔ نواب تبرک حسن خان دیوانہ وار پوتے کو ڈھونڈتے رہے مگر ناکام رہے۔ نواب صاحب نے برکت اللہ سے دوبارہ دوستی قائم کرنے کی غرض سے اپنے بیٹے کا رشتہ اس کی بیٹی سے طے کر دیا مگر اس بار بیٹے نے انکار کر دیا۔ یوں بچپن اور بزرگ عمری تک کی دوستی سرد جنگ میں بدل گئی۔ البتہ دونوں گھرانوں میں تعلقات بحال رہے۔ نواب صاحب کا بیٹا ایک فضائی حادثے میں اپنی بیوی اور بچے سمیت ہلاک ہو گیا۔

نواب صاحب گاؤں کا گھر چھوڑ کر ایک کالونی میں آئے جہاں کچھ عرصے بعد اتفاق سے برکت اللہ بھی ان کے ہمسائے بن کر آگئے۔ دونوں بزرگوں کی سرد جنگ سے پوری کالونی واقف تھی۔ برکت اللہ کی پوتی اور نواب صاحب کے نواسے احزار نے دونوں بزرگوں کی دوستی پھر سے کرائے کی ٹھانی۔ حرم اور احزار دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔

ام طیفور

دوسری اور آخری قسط

سپائلن کی رت



مکمل ٹول

ان کے ہمراہ تھے۔ بیس سالہ بیٹی سے لے کر سب سے چھوٹے پانچ سالہ بیٹے تک سب کے سب ایک لائن میں پھوپھو کے شانہ بشانہ کھڑے تھے۔ ایک طرف چار خال ساڑھ سوٹ کیس دھرے تھے جو پھپھو کے قریب تھے۔ پھوپھو کی عادت تھی کہ چاہے پندرہ دن رکنا ہو تا مسلمان وہ مینے کا باندھ کر لائی تھیں۔

اس دفعہ بھی ایسا ہی ہونے والا تھا، مگر فی الحال تو وہ پورے جوش و خروش سے یاری یاری گھر کے ایک ایک فرد سے گلے مل رہی تھیں۔ بھابیہوں سے ملنے کے بعد جب وہ بے جی کے گلے لگیں تو فرط جذبات سے رو دیں۔ پہلے ذرا دھیمے سروں میں اور پھر نان اوچی ہوئی چلی گئی۔ بے جی کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔ آخر بیٹی اتنے ماہ بعد آئی تھی، مگر فوزیہ پھوپھو کا سیشن ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ وہ عید ملنے کے انداز میں پہلے بے جی کے داہنے کندھے پر سر رکھ کر روتیں۔ دو جھٹکے کھائیں اور پھر یامین کا کندھے پر سر دے مارتیں۔ بے جی بے چاری ان کا سر ناک پر لگنے کے ڈر سے ناک کی سیدھ میں دیکھے جا رہی تھیں۔

ان ہی سوچوں میں غرق اپنے بستر میں لیٹے لیٹے اس نے ساڑھے نو گھنٹے تھے اور ابھی بھی اس کا لٹاف سے نکلنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ ایک گہری بو جھل سانس اندر کھینچتے ہوئے اس نے گروٹ بدلی تو کانوں میں ہلکے ہلکے شور کی آواز آئی جو رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے

یہ اعلان کر رہا تھا کہ باہر فوزیہ پھوپھو — آچکی ہیں۔ سب کے ملنے ملانے کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ ایک دھیمی سی مسکان نے اس کے ہونٹوں کو چھوا۔ اس وقت فوزیہ پھوپھو کا آنا ایسے اچھا لگا تھا۔ دل پر جو ایک بے نام سی اداسی طاری تھی وہ ضرور چھٹکتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ سستی جھاڑتی الماری میں سے کپڑے نکال کر واش روم میں جا گھسی۔



باہر بڑے سے صحن میں وہ قیامت کا شور مچا ہوا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر کوئی اپنی بین بجائے جا رہا تھا۔ فوزیہ پھوپھو پورے چھ ماہ بعد آئی تھیں اس دفعہ اور اس دفعہ پورے چھ بچے



جب تیسری سے چوتھی مرتبہ پھوپھو کا سر بے جی کے دائیں کاندھے پہ پڑا تو انہوں نے پھوپھو کی گندی پر ایک ہلکا ہاتھ جمایا اور بولیں۔

”اے موٹھا تیرے پیو والے جنوں تروڑن لگی ہوئی ہیں۔ پھوڑی!“ (یہ کندھا تمہارے باپ کا ہے جس کو توڑنے لگی ہوئی ہو۔ فوزیہ)

”بے جی! فوزیہ کل کیا کریں۔“ بچے گرو (بڑے) ہو گئے ہیں۔ ”پھوپھو کا نام بچپن سے گھر والوں نے لگا کر پھوڑی کر دیا تھا اور اب تک یہ نام باقی سب کے منہ سے تو اتر گیا تھا مگر بچی اور میاں جی ان بھی اسی نام سے تے تھے۔ جو فوزیہ پھوپھو کو تیر کی طرح لگتا۔ ابھی بھی برا ماننے ہوئے بے جی کو جتایا۔

فوزیہ پھوپھو جذبات پر قابو پاتے ہوئے وہیں دھپ سے بے جی کے پلنگ پر براجمان ہوئیں تو باقی افراد بھی کرسیاں کھینٹ کر ارد گرد ہی بیٹھ گئے۔ بچوں کا ٹولا صحن کے دوسری طرف دھماچوڑی چلانے میں مشغول ہو گیا۔

فوزیہ پھوپھو کی سب سے بڑی بیٹی قندیل عرف کینڈی بھی قدرے نزاکت کے ساتھ ماں کے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ دھر کر بیٹھ چکی تھی۔ فوزیہ پھوپھو نے پورے اشماک سے کینڈی کی قمیص کا پرنٹ تاؤٹی بیگم جمال کے گھٹنے پر زوردار دھپ رسید کی تو پرنٹ میں کبھی ان کی ”آکھیں“ گرتے گرتے پھیں۔ بے چاری بوکھلا کے منہ کا منہ دیکھنے لگیں۔

”الغرض! بھابھی! میں کیا ٹیل کر رہی کہ میں کتنا دھمپو کرتی ہوں آپ سب کو۔“ فوزیہ پھوپھو کی بات پر ارد گرد بیٹھے سب ہی افراد کے منہ سے نا سنجی والا ”ایس“ ”یوں نکلا تھا جیسے اندرین ڈراموں میں ایک چھینک مارنے کے بعد دو منٹ تک دھن دھناتا دھن ہوتی رہتی ہے۔

”میں نی پھوڑی۔ اے کی بولی اس تو۔؟“ بے جی نے ابرو اچکا کر فوراً سوال کیا۔ جواب کینڈی کی طرف سے آیا۔

”وہ اصل میں امی کے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ

بتا نہیں سکتیں کہ وہ آپ سب کو کتنا یاد کرتی ہیں۔“ ”واہ جی واہ۔“ بیگم جمال اور بیگم اجمل نے فوراً مرعوب ہو کر سر دھننے لگے۔ آٹھویں پاس پھوڑی نے

کتنے اشیاں سے فقرے میں انگریزی کے تروے (ٹائٹل) لگائے تھے۔ ان کے خود کے بچے اتنا پڑھ لکھ گئے تھے کہ وہ ایسا کمال کبھی نہیں دکھایا کرتے تھے۔ بے جی نے ناک چڑھا کر بیٹی کو گھورا اور منہ ہی منہ میں بددا امید۔

”ناگل دی پتو۔“ اب بھلا سووہل کے سامنے بیٹی کو کیا ٹوٹیں۔ البتہ میاں جی نے حقہ کھینٹ کر قریب کیا اور ایک بھر پور کش لے کر فخر سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”اے میری دھی شروع توں ہی لیت (لائق) کی۔“

میاں جی کی کھانسی سے مشابہ ہنسی نے باقی سب کو بھی ہنسا دیا بشمول کینڈی کے۔ جس کو پھوپھو نے کھیلاتے ہوئے شوکارا کر بیٹی اندر کر دیا۔ بے جی نے میاں جی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں گھر کا تو ان کی ہنسی کے انجن کو بریک لگا۔ بے جی نے مسکراہٹ دہاتے ہوئے بیٹی کو پکارا۔

میری بچی۔ ہم بھی تمہیں بت یاد کرتے تھے۔ چل چھوڑ ساری باتیں۔ مجھے یہ بتا کہ جیسے انگریزی کا ٹیکہ کس نے لگا دیا یا اپنی کینڈی والی منہ کا جو ٹھا کھالیا ہے۔

”لو نو بے جی۔ ابھی میں نے ڈیڑ نہیں ہوتا جو منہ کا جو ٹھا ایٹ کر لیا۔ اصل میں مسٹر ارشد (شوہر) نے کینڈی اشفت ہوئے کا پروگرام بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے خود سیٹ ہو جائیں تو پھر ہم سب کو بھی بلا لیں گے۔ اس لیے اب ہم سب ہوم میں ہی انگریزی اسپیک کرنے کی پریکٹس شریکیتس کرتے ہیں۔ یہ اپنی کینڈی تو اتنی پرینی (بیاری) انگلش بولتی ہے کہ۔ بس! ابھی ادھر آئے ہوئے ایک ڈنگی کا روالا (گدھا) گاڑی (ہماری چنگ) جی کے فرنٹ میں آگیا ایک دم۔ اس سے پہلے کہ چنگ چلی والا اور ڈنگی کا روالا آپس

ہوئے تھے۔ فوزیہ پھوپھو نے ان دونوں کے گلے لگ کر بھی آنسو بہانے کی کوشش کی تھی، مگر تھوڑی دیر پہلے تو ہنسنے ہنسنے لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں تو اب ایک دم

سے آنسو کہاں سے دیدار کروا رہے تھے۔ لہذا دوچار سسکیاں بھر لینے پر اکتفا کیا۔ کھانے پر خاصا اہتمام تھا۔ چہلی کباب جو پھوپھو کو بے حد مرغوب تھے وہ بطور خاص بھالہ بھولوں نے بڑی محبت سے نذر کے لیے بنائے تھے۔ اس کے علاوہ نرگسی کو فتنے بھی مینو کا خاص آئٹم تھے۔

میاں جی دوپہر کو کھانا نہیں کھاتے تھے۔ گرمیوں میں لسی اور سردیوں میں گرم گرم دودھ پیتے تھے۔ خوب سیر ہو کر۔ اب جو کھانا شروع ہوا تو پانی سب تو فرشی دسترخوان کے گرد بیٹھے تھے جب کہ میاں جی پیچھے صوفے پر بیٹھے شومئی قسمت فوزیہ پھوپھو ان کے بے حد قریب تھیں۔ ایک کباب ان کی بھری ہوئی پلیٹ سے اٹھایا۔ ایک کو فتنہ بھی اچک لیا۔ فوزیہ پھوپھو کن اکھیوں سے دیکھتیں۔ اپنے ایک کباب اور کو فتنے پہ صبر کرتی۔ ذرا سا رخ موڑ کر دوسری طرف بیٹھی اور لیس بھائی کی بیوی ژبیہ سے باتیں مضارنے لگیں۔ اس دفعہ وہ الرٹ تھیں۔ جیسے ہی میاں جی نے ایک لمبی سی ڈکار لے کر ان کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو پھوپھو نے لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر پلیٹ ان کی پہنچ سے دور کر دی۔

”کیا میاں جی! فتنہ تو بولتے ہوئے بھی آپ ماشاء اللہ سے کتنے ہی کباب اور کو فتنے پلیٹ گئے۔ اور پوچھنے پر آپ بولیں گے کہ میں لالچ تو نیک کرتا ہی نہیں۔ اب یہ میرا قاتل (آخری) کباب اور کو فتنہ ہے۔ ان پر تو آپ لک بھی نہ ڈالیں۔“ فوزیہ پھوپھو نے دوپٹے کی آڑ سے اپنی پلیٹ کو محفوظ کیا تھا۔

”دوپٹے غلط! میں نے تو تیرا ہی بھلا کیا ہے۔ شیدا مین نہ ہووے تے۔ یہ کباب اور کو فتنے دوڑے کے لیے ہیں اور تو رہنے والی اچھڑے کی۔ تم لوگ عادی ہو گھوٹے“ کھانے کے گائے کا قیر کھا

میں فائنٹ کر رہے تھے۔ میری کینڈی نے دونوں ہنڈیا اٹھا کر اتنے اسٹاکل سے بولائے۔ ”اسٹاپ۔ اینڈ گو ٹو بیل!“

اللہ! کچھ نہ پوچھیں بے جی۔ میاں جی! کیسے سب نے ٹرن ٹرن (مڑ مڑ) کر میری کینڈی کو دیکھا۔ فوزیہ پھوپھو نے بے حد غرور لاڈ سے پاس بیٹھی۔ اٹھلائی اور انگلی پر بالوں کی لٹ کا کنٹل بتائی کینڈی کی ٹھوڑی کو چھوا تھا۔ ہونق سی میر عوبیت ہنوز بیگم جمال اور اجمل کے چروں پر چھائی تھی جب کہ بے جی نے فوزیہ پھوپھو کو بغور سر سے پیر تک دیکھا اور میاں جی سے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

”میں نے کہا جی! یہ ڈنگی کار کینڈی ہے۔“ ”کھو تار بڑھی۔“ میاں جی نے بڑی سادگت سے ایک ابرو اچکا کر۔ حقے کی منہ میں دبا کر اور دھیسے دھیسے گردن ہلا کر جواب دیا تھا۔ بے جی نے ناک چڑھا کر ”اے!“ والی شکل بتائی اور فوزیہ پھوپھو کا ایک بار پھر سر سے پیر تک جائزہ لیا اور سبجے کو سرسری بتاتے ہوئے بولیں۔

”ہیں بی پھوڑی! تو کتنے دن رہتا ہے۔“ ”دن منٹہ یعنی ایک ماہ!“ فوزیہ پھوپھو نے لاپرواہی سے جواب دیا اور برآمدے کی سیڑھیاں اترتی حرم کو دیکھ کر بھٹ اٹھ کر اس کی طرف بڑھ گئیں۔ بے جی نے ایک لمبا اور ٹھنڈا اسٹاکل فضا میں چھوڑا جب کہ میاں جی نے انہیں مزو لیتی نظروں سے دیکھا اور اٹل انداز میں آئی کسی کو حقے کی منہ تلے دباے اسے نذر نذر سے گزرا دے گئے۔ دونوں بھالیاں ”مریدوں“ کی شکل لیے نذر کے کھانے پینے کا خصوصی انتظام کرنے کچن میں جا گھسی تھیں۔



دوپہر کا کھانا کھا کر سب تسلی سے بیٹھے تھے۔ لاؤنج میں ہی محفل جی تھی۔ فوزیہ پھوپھو کی وجہ سے گھر کے سب مرد بھی کھانے کے وقت موجود تھے۔ جمال اور اجمل صاحب بھی بہن کو دیکھ کر بے حد خوش

کر کہیں تیرا (سانس) لو کھانہ ہو جائے میاں جی چڑاتی ہوئی نظروں سے بٹی کو دیکھ کر بولے۔
 فوزیہ پھوپھو حشمائیں نگاہوں سے انہیں دیکھے گئیں۔ پھر بے جی کو متوجہ کرتے ہوئے بولیں۔

”لگ کریں بے جی۔ کیسے میاں جی ہم ”لاہوریز“ کو باتیں سنا رہے ہیں۔ امپورٹ (لازی) تو نہیں نا کہ پورے لاہور نے ڈنگی کھائے ہوں۔“

بے جی نے نوالہ نگل کر پانی کا گھونٹ بھرا اور پرسوج انداز میں فوزیہ پھوپھو کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

”ویسے پھوڑی۔ پچھلی داری اسی جب تیرے گھر آئے تھے لاہور۔ تیرے شہر اپنا۔ لینن واسطے اس ویلے تیرا کھسم عجیب کھوتیاں والیاں حرکتیں کرتا تھا۔ چھلانگ مار کر کبھی اندر تے کبھی باہر۔ ہنستا تھا تو بچارے کے گلے سے کھوتے کی آوازیں آتی تھیں۔“

بے جی کی بات پر گھر کے سب ہی افراد کھلکھلا کر ہنس دیے۔ وہ سب ایسی صورت حال کے علوی تھے اس لیے انجوائے کر رہے تھے۔

تیکم جمال نے ایک کباب اٹھا کر اور تیکم اجمل نے ایک زرگسی کوفتہ اٹھا کر فائٹ روٹھی روٹھی سی فوزیہ پھوپھو کی پلیٹ میں رکھ کر ”مریدی“ کا فرض نبھایا۔ فوزیہ پھوپھو نے بھی اتراتے ہوئے ”مذرانہ“ قبول کیا اور چہرہ بھی کھل اٹھا۔

ان تمام ہنستے مسکراتے چروں میں واحد حرم تھی جو پر تفکر چہرہ لیے جلدی جلدی نوالے نگل رہی تھی۔ اس نے ایک نظر اٹھا کر عمیس کو دیکھا مگر وہ کمینہ بن دکھاتے ہوئے مسلسل کینڈی کو دیکھ رہا تھا اور کینڈی پلیٹ دسترخوان سے اٹھا کر ہاتھ میں تھامے ہوئے تھی اور کانٹے سے زرگسی کوفتے کو بھی ادھر لڑھکاتی تو کبھی ادھر۔ ایک بے نیازی نگاہ گاہے بگاہے عمیس پر بھی ڈالتی تھی۔ ایسی ہی ایک ”مست“ نظر میں کھوتے کو ذرا زور کی ”شات“ لگ گئی اور وہ بے شرم پلیٹ کی باؤنڈری وال کر اس کرتا پھیرکتا ہوا۔ کب

سے قیہوں کی طرح بڑے ”آلو گوشت“ کے سالن میں سونگنگ کرنے لگی غرض سے کوڑ پڑا۔ ”ہا۔۔۔ اوہ۔۔۔ ہائے۔۔۔“ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ارد گرد بیٹھے کافی لوگ شور بے سے فیض یاب ہوئے تھے اور اب سب کینڈی کو فوکس کیے ہوئے تھے وہ بے چاری ہونٹ بنی کبھی ہاتھ میں تھامے کانٹے کو دیکھتی تو کبھی کوفتے کو۔ ساری شوخی ”شور بے“ میں ڈوب کے مر گئی تھی۔

حرم نے موقع غنیمت جان کر پاس پر اچھے تاک کے عمیس کے گھٹنے پر مارا۔ وہ بے چارہ کینڈی کو بھول کر ”کوڈا“ پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔ حرم کو قدرے غصے سے گھورا تو اس نے جھٹ سے کوئی اشارہ دیا جسے عمیس نے سمجھ کر پہلے تو ناک بھوں چڑھائی۔ اس کے بعد انگوٹھا دکھا کر ”ڈن“ کا سنگٹل دے دیا۔ حرم چپکے سے اٹھی اور لاؤنج سے باہر نکل گئی۔



چھت رنٹل رنٹل کر اس کی ٹانگیں جواب دے رہی تھیں مگر ابھی تک احرار اپنی چھت پر نہیں آیا تھا۔ اب اس کا نظر طیش میں بدلتا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگلے پانچ منٹ تک اگر وہ نہیں آیا تو مارے غصے کے اس کا سر پھاڑ ڈالے گی۔

پہلے ہی کم پریشانی تھی جو ری سی کس فوزیہ پھوپھو کی آمد نے پوری کردی تھی۔ ان کا اتنا وہ معمول کے مطابق سمجھی مگر آج جس وقت وہ فریض ہو کر فوزیہ پھوپھو سے ملنے صحن میں گئی تھی۔ انہوں نے اس کے گل چوم چوم گھسا ڈالے تھے۔ اسے اچنبھا ہوا تھا۔ اتنی دلاری تو وہ پھوپھو کی کبھی بھی نہیں رہی تھی اور پھر کینڈی نے گلے لگتے ہوئے چند سینکڑوں میں جو کچھ اس کے کان میں اٹھایا۔ اس کا دماغ سانس سانس کرنے لگا تھا۔ فوزیہ پھوپھو اپنے جینٹھ کے بیٹے کا رشتہ لائی تھیں۔ وہ بھی پوری تیاری کے ساتھ۔ ان کے قیام کے دوسرے ہفتے میں ان کے جینٹھ اور جھٹائی باقاعدہ رشتہ لائے والے تھے۔ تب سے وہ

احرار سے بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہی تھی۔ یہ بات سیل فون پر کرنے والی نہیں تھی۔ وہ اس سے دبدو اور دو ٹوک بات کرنا چاہتی تھی۔

اور اب آدھا گھنٹہ بیت گیا تھا اسے احرار کے انتظار میں، مگر وہ بھی آج اس کا صبر آزمانے پر تلا تھا۔

اتنی دیر تک وہ ”گشیدہ“ بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کی ڈھنڈیا پڑ جانی تھی۔ بے بسی سے ہونٹ کاٹتی وہ اب واپس ہونے کو بھی جب ساتھ والی چھت پر مانوس آہٹ نے اس کی دھڑکنوں کو تیز کر دیا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اچک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ دیوار کے پار پہلے احرار کا خوب صورت بالوں سے بھرا سر نمودار ہوا۔ پھر وہ خود سالم کا سالم بڑی مہارت اور پھرتی سے دیوار بچانے کا اس یار کو دکھایا۔ اس کی گہری سبز آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ نیوی بلیوئی شرٹ کے ساتھ گرے جینز پہنے۔ دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر گھڑی کا اسٹریپ بند کرنا وہ بے نیازی سے چلتا اس کے قریب آ رہا تھا۔ حرم کو اینا دل بے اختیار ہونا محسوس ہوا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے گی۔ احرار کے شوقی سے کھنکھارنے پر اس کا فون ٹوٹا اور اسے یاد آیا کہ وہ تو ناراض تھی۔ فوراً ”منہ پھلا کر سن پھیر لیا۔

”کیا ہوا جان من! ناراض ہو۔؟“ انداز صاف چڑانے والا تھا اور وہ واقعی چڑ گئی تھی۔

”نکو اس نہیں کوف۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ مجھے اس طرح کے گھٹیا ناچوں سے مت بلایا کوف۔ چپ لگتا ہے۔“ دھڑکتے دل کو سنبھال کر وہ قدرے ڈپٹ کر بولی۔

”اچھا! کیا حال ہے مولیٰ؟ اب ٹھیک ہے۔؟“ سر کو کھجاتے ہوئے وہ اس سے بڑی معصومیت سے سوال کر رہا تھا۔

”کیا کہا۔ مولیٰ! میں اور مولیٰ!“ حرم نے ایک نگاہ بے یقین اپنے سر پہنے پر ڈالی اور آنکھیں پھاڑتے ہوئے جارحانہ انداز میں اس سے پوچھا۔

”نہیں۔ تم نہیں۔ تمہارے پیچھے تمہاری کزن کھڑی ہے۔ اس کو بولا۔“ وہ حرم کے عقب میں دیکھتے ہوئے بھرپور سنجیدگی سے بولا۔ وہ بے چاری بری طرح گھبرا کر بیٹھی، مگر پیچھے کوئی ہوتا تو دکھائی دیتا۔ حرم خفا سی بیڑھوں کی طرف بڑھنے لگی تھی جب احرار نے ایک جھٹکے سے اس کی کلائی تھام کر روکا تھا۔

”ناراض ہو کر جا رہی ہو۔؟“

”نہیں۔ میں بھلا کیوں ناراض ہونے لگی۔ حالات کسی بھی نہج پر چلے جائیں۔ ناراضی کیسی! آدھے گھنٹے سے خوار ہو رہی ہوں چھت پر۔ مگر تمہیں پروا ہی نہیں۔ ناراضی کیسی؟ گھر میں پھوپھو میرا رشتہ لے کر پہنچ گئی ہیں۔ منظور ہو گیا تو کیا؟“ ناراضی کیسی؟“ وہ روٹا سی ہوئی بولے چلی گئی۔ پھر ہاتھ چھڑا کر وہیں مازیل کے بیچ پر تک گئی۔ آنکھوں میں نمی تھی۔ جنہیں وہ پلکیں جھپک جھپک کر چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ احرار بے چین سا ہو کر اس کے قریب پہنچوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا۔

”اچھا سوری۔ قسم سے مجھے نہیں معلوم تھا کہ مسئلہ اتنا گنہگار ہے۔ اور جہاں تک چھت پر در سے آنے کا تعلق ہے تو مجھے ابھی ابھی تو عیس نے تمہارا پیغام دیا ہے۔ جیسے ہی اس نے مجھے بتایا میں سب کالم چھوڑ چھاڑا اور چلا آیا۔“

”یہ عیس بھی نا۔ ایک نمبر کا کمینہ ہے۔ اور آج تو اس کا مارچ صبح سے ٹھکانے نہیں ہے۔ پھوپھو فوزیہ کی کینڈی کو پٹانے میں لگا ہے۔ گدھا کہیں کا۔!“ وہ غصے سے ہاتھ کا مکا بنا کر بیچ پر مارتے ہوئے بولی۔

”کہیں کا نہیں۔ ہمیں کالے میں نے ایسا گدھا کسی اور کے پاس نہیں دیکھا۔ قسم کھا کر کہتا ہوں۔“ احرار نے شرارت سے ہنستے ہوئے کہا، مگر جواباً حرم مسکرا بھی نہ سکی۔

”کیوں اتنی منشن لے رہی ہو۔؟ ابھی صرف رشتہ آیا ہے۔ منظور تو نہیں ہو گیا نا۔ رشتے تو آتے

وقت کے لیے۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے
نہیں دیے۔

”تو سننا لیتے نا“ آپ کو منع کس نے کیا تھا۔“
وہ ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔

”ہمیں یہی گڑ تو نہیں آیا کہ کوئی گھر سنبھال
رکھتے۔ دکر نہ برا وقت ہمیں یوں بچھاڑ کر بیت
جائے۔ ہمارا پورا وجود چھٹی بن گیا۔ پورے پورے
دکھ نکلتا ہے جناب۔“ وہ ایک دم بے حد آزرہ

ہو گئے۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ پتا نہیں کیا کچھ یاد
آیا تھا۔ ان کے مقابل بیٹھے عم خوار نے اپنا ہاتھ ان
کے ہاتھ پر دھر اور دلا سا دیا تھا۔

”رشتوں میں اکھاڑ بچھاڑ تو زندگی کا حصہ ہے۔
قدرت کے کھیل بڑے عجیب ہیں۔ زندگی میں جو
لوگ ہمیں زخم دیتے ہیں وہی مرہم بن جاتے ہیں۔
اچھا وقت برے وقت کے یوں میں چھپا بیٹھا ہوتا
ہے۔ پر پھر پھرنے کی دیر ہوتی ہے بس اور کیا چلت
جانی ہے۔“ وہ دم لگے میں نواب حسین احمد خان کی
آنکھوں میں جھتی امید کی لو کو تیل دے رہے تھے۔
”کیا وہ بھی بیٹھے سینے سے لگائے گا۔“ حسین
احمد خان نے حسرت سے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔ انسان کے سینے میں بڑی متعاش
ہوتی ہے۔ پھاٹوں سلوزن سمونے کی سکت رکھتا
ہے۔

”چلیے چھوٹیے ان باتوں کو۔ آپ کی
”جیسی“ میں طاقات ہوتی چاہیے کہ مقابل کے دل
کی رگوں تک آپ کے سینے کی حرارت پہنچ جائے۔“
ہلہلہ

انہوں نے پورے جوش سے نواب صاحب کے
ہاتھ کی پشت کو چھتے پایا اور شطرنج کی سلاطین پر ایک دفعہ
پھر مرے سیٹ ہونے لگے۔ کھیل ابھی باقی تھا۔



”کچر کچر۔ کچر کچر۔“ مولیاں اور گاجریں
جیہانے کی آوازیں پورے صحن میں چکراتی پھر رہی

تھیں۔ بچے اسکولوں کو حرم اپنے کالج اور مدرسے
کام پر۔ لہذا تسلی بخش ناشتوں کے بعد ساری خواتین
گھر کے صحن میں آ بیٹھی تھیں۔ موسم میں ہلکی ہلکی
خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔ دھوپ سینکے کوئی کرنا
تھا۔ بیگم اجمل سبزیوں کی نوکری بھی لیتی آئی
تھیں۔ باتوں باتوں میں بن جانی بھی سبزی بھی کچھ
دونوں دیورانی جھٹھانی نے جب فوزیہ پھوپھو کو بے جی
کے پاس فرصت سے بیٹھے دیکھا تو اس کی صحبت سے

فیض یاب ہونے کا موقع کیسے جانے دے سکتی
تھیں۔ آج کل تو خواب میں بھی دونوں اپنی اکلوتی
نندے سے ”گرو منگ کلاس“ لیتی تھیں اور صبح جب اٹھتی
تھیں تو خود کو سرٹائی فائڈ محسوس کرتی تھیں۔

اوپر ادھر کی باتوں میں سبزی بننے کا پتا بھی نہیں چلا
اور اب مولیوں اور گاجریوں کا دور چل رہا تھا۔ کیڑی
گو بھی کے ڈھل اور مٹر کے چھلکے بھینس کے آگے
ڈال کر آئی۔ بیگم جمال کو وہ بڑی اپنی اپنی سی لگی۔

”مے پھوڑی۔! تو کیوں نہیں کھاندی مولی۔
اے دیکھ تے سہی کئی مٹھی شید (شیر) اے۔ لے
ذرا۔ چک مار کے دیکھ۔“ بے جی نے مولی پر نمک
اور لال مرچ لگا کر فوزیہ پھوپھو کی طرف بڑھائی۔ جواباً
انہوں نے خوب ناک چڑھا کر اور دائیں آنکھ قدرے
موند کر نخوت سے اے بے جی کیا۔

”تو بے جی۔! میں نہیں کھاتی۔ اس کی تو
المنہل ہی اتنی آتی رہتی ہے ہاتھ سے۔ اور پھر
ڈکارس بھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔“

بیگم جمال اور بیگم اجمل نے ایک ساتھ اچھکائی
مولی کو نے یہ بندھی بھینس کی طرف اچھکائی تھی اور
ایک دوسرے کو اس حکمت عملی پر توصیفی نگاہوں
سے دیکھا تھا۔

”رفع دور۔! بے جی نے ہاتھ جھٹک کر بیٹی کو
”رفع دور“ کیا۔

”وڈی آئی شونی۔ ایاء نہ پڑھی دخت تو پھڑی۔
ساری عمر ایہ کوچ کھا کھا کے بن اگریزاں دے“ وڈو

”مچھی“ کھان واخیال آیا اسے شیدائین نہ ہووے تے۔“

”بس بتائیں بے جی۔! آپ نے ہی استونز مارنے جس تو بھلا شریکوں کی کیا ضرورت۔“ فوزیہ پھوپھو پر امانتے ہوئے گردن اکڑا کر بولیں۔

”نامیتوں دس۔ کڑی داویا متیں او کرنا۔“ بے جی کے سوال پر بیگم جمال کے کان فوراً کھڑے ہوئے تھے اور حواس چوکس۔ آخر انہیں ابھی عہس کو بیاہنا تھا اور کینڈی انہیں بے حد بھائی تھی۔ بیگم اجمل کو قلع سا جاگا۔ کاش زارون ادھر ہو تیا پھر ان کا گونگوبی وڈا ہوتا۔

”افوہ۔! بے جی ابھی اتج ہی کیا ہے۔! نو تھری ایرز ذرا کینڈا جا کر انجوائے تو کر لے میری ڈائٹ۔ نیا گرافال کا وائر بھی واچ کر لے پھر میرج کروں گی اس کی۔“ فوزیہ پھوپھو کا لمبا پلان تھا۔ بے جی نے بھنوس اچکا کر چند لمحے منہ کے زاویے بگاڑ کر بیٹی کو گھورا اور پھر اسی انداز میں قریب تیجھی کینڈی سے مخاطب ہوئیں۔

”پتر۔! اے کی بونکدی بیٹی اسے؟ کینڈی سٹپائی۔! ماں کو دکھاؤ ان کے انداز میں لا پرواہی تھی جیسے بے جی کے یوں کہنے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑا۔

”دوس۔! بے جی! اما کے کہنے کا مطلب ہے کہ ابھی میری عمر ہی کیا ہے، دو تین سال ذرا کینڈا جا کر ان کی ڈائٹ۔ یعنی کہ میں۔ کینڈا کا دائٹ۔ یعنی کہ پانی کے مزے لے لوں تو پھر میری شادی کے بارے میں سوچیں گی۔! آخری جملے کی اداہنگی تک کینڈی کا لہجہ شریکوں ہو گیا۔ جو سیدھا بیگم جمال کے دل میں ترازو ہوا تھا۔ تکتے سبھاؤ سے ماں کی بات کی شرتج کی تھی اس نے۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ یہاں سے اٹھ کر پہلا کام انہیں کینڈی سے مرچیں وار کر چولے میں جھونکنے کا کرنا ہے۔! بے جی کی پاٹ دار آواز انہیں مرچوں سے واپس مولیوں کا جروں میں

”میں نے کہا وہی (بیگم جمال)۔! ذرا تھوڑا سا دائر میری بیٹی پر ڈالو۔ اس کے دماغ میں خشکی ہو گئی اسے۔“

”آپ ٹینشن نہ لیں بے جی۔!“ فوزیہ پھوپھو نے صلح جو انداز میں ماں کے گھٹنے پر ہاتھ دھرا۔ مجھے کینڈا چاہیے دیں بس۔ ساری ڈرائی سیں۔ کیلی ہو جائے گی۔! پھوپھو کی بات پر سب ہی نے سر دھنا تھا۔ بے جی نے تاسف سے اور دونوں بھابھیوں نے سٹائش۔! ”ابھی آپ میری ایک ناک غور سے سیں۔!“ فوزیہ پھوپھو نے بے جی کے قریب کھسک کے رازدارانہ ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

”پہلے بندے دی پتر بن کے گل کسے پھر میں سنوں گی متیں تے دفع دور۔!“ انہوں نے گھٹنے پہ دھرا فوزیہ پھوپھو کا ہاتھ جھٹک کر دو ٹوک انداز میں کہا۔

”افوہ بے جی۔! آپ بھی نا۔! اچھا صرف ابھی کے لیے۔ بعد میں، میں دوبارہ اپنی لینگو تچ میں ہی بات کروں گی۔ پھر آپ نے مجھے نہیں ٹوکنا۔!“

”ہن بول بھی دے۔! بے جی نے ناک پر سے کھچی اڑائی۔

”وصل میں، میں اس دفعہ ایک خاص مقصد کے تحت یہاں آئی ہوں، اتنا خاص۔ اتنا خاص۔۔۔ کس۔!“

”ہن تو تجبی واری بولی تے تیرے خاص وچ پاس پے جانی اسے۔“ (اب تم تیسری دفعہ بولی تو تیرے خاص میں بو پڑ جانی ہے) بے جی نے فوزیہ پھوپھو کے ہاتھ پر پتلی سی مولی مارتے ہوئے کہا۔ وہ بے چاری جھٹ سے ہاتھ سہلانے لگیں۔

”اچھا۔! اچھا بول رہی تھی میں۔ بات کا سارا مزہ کر کر کر دیا آپ نے بے جی۔! ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میں اس دفعہ اکیلی نہیں آئی۔ بلکہ۔!“

”آہو۔! چھ شٹو گھڑے (بچے) دی ٹال نے تیرے۔! افلاطون دی اولادواں۔! بے جی بے پھر

فوزیہ پھوپھو کی بات کاٹ کر لقمہ دیا۔

”ہاں۔ ہائے بے جی۔! آپ کو تو میری اولاد ویسے ہی نہیں بھائی۔ اب اگر وہ آپ کے پوتوں پوتیوں سے زیادہ حسین اور ذہین ہیں تو آپ صبر سے کام لیں۔ کیا پتا آپ کے پوتوں کے پوتوں میں کوئی ایسا نکل ہی آئے۔! فوزیہ پھوپھو نے مبالغہ آرائی کی حد کر دی۔

اب کے بے جی نے نوکری میں کوئی موٹی سی موٹی ڈھونڈنے کی کوشش کی جسے وہ ان کے سر پر مارتیں۔ بیگم اجمل نے فوراً ”بے جی کے آگے سے نوکری جھٹ لی اور صلح جو انداز میں بے جی سے مخاطب ہوئیں۔

”آپ پہلے بات تو سن لیں پھوڑی۔ میرا مطلب فوزیہ کی بے جی۔! کیا پتا کتنی ضروری بات ہو جو ابھی تک ادھوری ہے۔!

بے جی تیکھے چہرے پر بیٹی کی طرف متوجہ ہوئیں تو فوزیہ پھوپھو بڑے گھما کر سر آگے کیا۔

”میں اپنی بیٹی حرم کے لیے اپنے جیٹھ کے بیٹے ہارون کا رشتہ لانی ہوں۔! اپنے تئیں ہم پھوڑ کر فوزیہ پھوپھو نے سب کے تاثرات جانچے مگر بیٹیوں خواتین ایک دم چپ سی انہیں دیکھے گئیں۔ چند لمحے مزید یوں ہی بیت گئے اور پھر سب سے پہلے بے جی نے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

”قلمے منے۔! دفعہ دوسرا۔! فوزیہ پھوپھو کو ایسے جواب کی توقع ہو کر نہیں تھی۔ سنا کر چیخے ہوئیں۔ ”یہ وہی جیٹھ کا پتر ہے تاہم سب سے ختم تو آپ ”ہاں جی کا پتر“ کہتی تھی۔“

فوزیہ پھوپھو حیرت سے جی ہی جی میں بے جی کی یادداشت کو سات سلام پیش کر رہی تھیں۔ کینڈی منہ پھیر کر ہنسی روکنے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھی۔ جبکہ بیگم اجمل اور اجمل کے تاثرات سے ابھی کچھ بھی اندازہ لگانا بے حد مشکل تھا۔ دونوں مجیدہ اور سپاٹ چہرے لیے اپنی ساس اور نند کا مکالمہ

ملاحظہ کر رہی تھیں۔

”بے جی۔! وہ تو بچپن کی بات ہے تب ہارون ذرا موٹا ہوا تھا۔!“

”(اچھا)۔! تہہ بچپن دو سال وچ گیا وہ بھی واہ تے اب کتنا موٹا ہے نہانا۔“ بے جی استہزائیہ کجے میں سوال کیا۔

”اب بھی ذرا سا ہی موٹا ہے وہ بے جی۔ کام سے لگا ہے تو کملا گیا ہے۔!“ فوزیہ پھوپھو نے کمزور سا دفاع کیا۔ تب ہی کینڈی بیچ میں بول پڑی۔

”کدھر ملا۔! ویسے کے ویسے ہی ہیں ہارون بھائی۔ بلکہ پہلے تو پھر آنکھیں دھکتی تھیں اب تو ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔ اب بھی ذرا ڈھیل دے کر

بیٹھیں تو جی ہی کی آواز کے ساتھ ان کی پتلون پھٹ جاتی ہے۔ پچھل مفلکی بھی اسی لیے ٹوٹ۔!“ ”جو اس بند کرو کینڈی۔!“ فوزیہ پھوپھو نے اسے بری طرح ڈانٹا اور بایاں ابرو اچکا اچکا کر چپ کرنے کا اشارہ کیا۔

”بے جی! اس کی عادت ہے بک بک کرنے کی۔“ متنی شنگنی نہیں ہوئی تھی بس یوں ہی بات چلی تھی۔ مگر ہارون کو لڑکی نہیں بھائی تھی اس لیے بات وہیں کی وہیں ختم ہو گئی۔!

”سیدھی طرح بول کہ کڑی نولڈو چھی جیسا ہارون نہیں بھالی۔ بڑی آئی کہنے والی۔ ہارون کو لڑکی نہیں بھائی۔!“ بے جی نے باقاعدہ منہ نیڑھا کر کے فوزیہ پھوپھو کی نقل کی۔ وہ شرمندہ سی نوکری میں رکھی بنزیاں پھولنے لگیں۔

”دیکھ پھوڑی۔! حرم کے ساتھ دشمنی نہ کر۔ اتنا ہی اولڑکا اچھا ہے تے اپنی کینڈی داہیاہ کر دے اووے نال۔ میری پوتی کو کیوں پھنسانی ہے۔!“ بے جی انگلی اٹھا کر دو ٹوک انداز میں بولیں تو فوزیہ پھوپھو فوراً ”جذباتی ہو گئیں۔

”اللہ نہ کرے بے جی۔! میں کیوں پھنسانے لگی اپنی بیٹی کو۔ میری کینڈی نے جھٹھالی کا دودھ پیا ہے

کہ کیا تم حرم کو کسی کھاتے پیتے گھر انے میں نہیں
بیابنا چاہتی۔ جواب دواس کو۔ کیا کہتی ہو تم اس
رشتے کے متعلق۔ ”بیگم جمال نے بڑے مدبرانہ
انداز میں اپنی دیورانی کو پوری بات کا ترجمہ کر کے
بتایا۔ آنکھوں میں غم بھی ناچ رہا تھا ”دیکھا! مجھے سمجھ
آئی فوزیہ کی انگریزی کی۔“

”میں کیا بولوں بھابی جی! جو بے جی اور میاں
جی کا فیصلہ ہو گا وہی میرا بھی۔ حرم کے لیے ان سے
زیادہ اچھا کون سوچ سکتا ہے بھلا۔“ بے جی نے ہو
کے جواب پر جتنائی نگاہوں سے فوزیہ پھوپھو کو دیکھا۔
”ہن بول۔“ فوزیہ پھوپھو نے نخوت سے بیگم
اجمل کو دیکھ کر سر جھٹکا تھا۔

”دنگر جی نہ ہووے تے۔“ جی بی جی میں
بدبدا میں اور غصہ اب بھی پنجابی میں ہی نکالتی تھیں
بھلے دل میں ہی سی۔

”ٹھیک ہے بے جی! ڈن ہو گیا۔ اب یہ سارا
میر میں میاں جی کے آگے رکھوں گی۔ وہ اس رشتے
کو رفوز نہیں کریں گے۔“ وہ پورے بھروسے سے
کہتی ہوئی انھیں اور اندر چلی گئیں۔

”ہو نہ! دفع دو۔“ بے جی نے بھی ان کی
رشتہ پر باقاعدہ ہاتھ سے لعنت بھیجی۔ دونوں بھابیاں
بھی اچھ کر ٹوکریاں سینتی زند کے پیچھے چل
دیں۔ انیس فوزیہ پھوپھو کی ناراضی کی فکر لگی
تھی۔

”محسن میں اب صرف بے جی اور کینڈی بیٹی رہ گئی
تھیں۔ کینڈی بے چاری مسلسل شرمندہ ہی کوئی
میں بندھی چکلی کرتی تھیں کوئی جارہی تھی۔
جبکہ بے جی کی آنکھوں میں نظر ہلکورے لیتا صاف
نظر آ رہا تھا۔“

”آ۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔! صبح صادق کا وقت تھا اور
حسین احمد خان اپنے التو کو تروں کو چھت بردان ڈال
رہے تھے۔ کابک چلی ہوئی تھی اور سارے گہو تر اس

ورنہ ضرور بیاہ دیتی میں اسے ہارون کے ساتھ۔ اور
حرم کے لیے خود میری جھٹائی نے بات کی ہے۔ میں
خود بھی چاہتی ہوں بے جی کہ میرے میکے کی بچی کھپ
جائے ہارون کے ساتھ۔ اتنی بڑی لمبی چوڑی جائیداد
ہے اس اکیلے کی۔ باہر سے جو آکر راج کرے گی
کوئی۔ تو اپنی حرم کیوں نہیں؟ میں جب کینڈا
چلی جاؤں تو کوئی میرا انا میرے پیچھے موجود ہو جو میرے
پورشن کی رکھوالی کر سکے۔ آج کل کسی کا کیا بھروسا
بے جی۔“

”بہت اچھے اسے! بے جی نے اپنے گھٹے پر
خوب زور کا ہاتھ مارا جیسے خود کو شہلاش دی ہو۔“ تو
اصل میں یہ بات ہے۔ تمہیں جو کیداری کے واسطے
اپنا بندہ چاہیے۔ شرم نہیں آتی تجھے فوزی۔ وہ
گائے کا بچہ ہی ملا تھا میری حرم واسطے۔ بھل جا۔
اے رشتہ نہیں ہو سکتا۔ تے ٹالے اپنی جھٹھ اور
جھٹائی کو بھی منع کر دے کہ خوار جو ادھر آئے۔
میں ٹائلیں توڑ دیاں گی۔“ بے جی نے ایک موٹی کو
ٹھیک درمیان سے ٹھک کر کے توڑا جیسے جج میں فوزیہ
پھوپھو کے جھٹھ کی ٹانگہ ہاتھ میں ہو۔

”لحٹ ہو گئی بے جی۔ وہ میرے ان لازم ہیں۔
آپ ان کی لیک بریک کریں گی تو وہ میرے ساتھ رشتہ
بریک کر دیں گے۔ میں کسی کو اپنا فیس دکھانے کے
قاتل نہیں رہوں گی۔“ فوزیہ پھوپھو اپنی جون میں
لوٹ آئی تھیں اور اب قدرے خفا سی بے جی کو
حالات اور تعلقات کی نزاکت سے باخبر کر رہی
تھیں۔ بیگم جمال اور بیگم اجمل بھی کچھ کچھ قائل
سی نظر آ رہی تھیں۔

”کیوں چھوٹی بھابی! آپ بتائیں کہ آپ حرم
کی میرج کسی اچھی اینٹنگ ڈرننگ میل میں کرنا
لائیک نہیں کریں گی کیا۔“ فوزیہ پھوپھو نے یکدم
بیگم اجمل سے سوال کیا تھا اور جواباً وہ بے چاری
ہوئی سی محض اتنا ہی بول سکیں۔

”ہن۔“

”بی۔“ اوف۔! یہ اپنی فوزیہ کے کہنے کا مطلب ہے

وقت تازہ ہوا کا مزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر مٹھی بھر بارہ اچھال کر فرش پر پھینکا اور آواز لگائی۔

”آ۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ۔“

”کھا۔ کھا۔ کھا۔ سب کو کھا۔“ حسین احمد خان چوٹے اور پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی نہیں تھا۔ نگاہ ساتھ والوں کی چھت پر پڑی تو برکت اللہ چارپائی پر لنگی کرتا پینے ٹائیس پیارے بیٹھے تھے۔ پسلو میں موٹا تازہ شیردہ (پالتو بلا) بیٹھا تھا جو بار بار اپنی زبان ہونٹوں پر پھیرتا تھا۔ جیسے ہی ہمسائے سے آواز آئی۔

”آ۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ۔“ یہ بلا توقف اونچی آواز میں شیردہ کو ترغیب دیتے۔

”کھا۔ کھا۔ کھا۔“

حسین احمد خان کا خون کھول رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی یہ شیردہ کم بخت ان کے اتنے خوب صورت اور قیمتی کیو تر ہڈ چکا تھا۔ وہ دانہ ڈالنے کا کام موقوف کرتے ہوئے کیو ترول کو کابک میں بند کرنے کی نیت سے آگے بڑھے۔ برکت اللہ نے ہانک لگائی۔

”نس جا۔ نس جا۔ خفاٹ نس جا کیو تر۔“

حسین احمد خان نے خون کا ٹھونٹ بھرا اور جی ہی جی میں برکت اللہ کو کوسا۔

انہوں نے سوچا کہ کیو ترول کو یونہی چھوڑ کر خود بچے چلے جائیں اور کل وقتی ملازم لڑکے سے کہہ کر کیو تر کابک میں بند کروائیں۔ یہی سوچ کر وہ بیڑیوں کی طرف مڑے تھے کہ کندھوں پر اوڑھی ہوئی گرم مردانہ شل میں پاؤں ٹانگ گپکرتے کرتے بچے۔

ادھر برکت اللہ چھڑائی (چھلانگ) مار کر یکدم

چارپائی سے اترے تھے اور بے چینی سے دونوں پھتوں کے بیچ کی دیوار کے قریب چلے آئے۔ مگر جب منین احمد خان کو سنبھلتے دیکھا تو خود کو بھی بے نیاز پوز لے لے ہوئے کلن کے اندر انگلی پھیرتے ہوئے

”اک تو تیری نازک مزاجیاں منس گئیں۔ یا لا

(سردی) ابھی اندروں میں وڑا (گھسا) منیں اور تو ٹھنڈے ٹھنڈے کر بچا چوچا (بھگا چونہ) بن جاتا ہے۔ تیرا تو وہ حال ہے کہ کیلنڈر پہ بدل (بادل) کو لکھ لے تو جرسی چڑھا کر آجاتا ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ برکت اللہ خود ہی اپنی جگت پر اتنا ہے کہ کھانسی چھڑ گئی۔ ہنستے جاتے اور کھانستے جاتے۔ حسین احمد خان کے بس میں ہوتا تو ایسا عمل کرتے کہ برکت اللہ کیو تر بن جاتے اور وہ مزے سے انہیں بچرے میں پھنسا دیتا۔

”ہم آپ کے منہ نہیں لگتا چاہتے برکت اللہ۔ بہتر ہے کہ آپ بھی احتراز بچتے۔ ورنہ باتیں ہمارے پاس بھی ہیں کہنے کو۔“ حسین احمد خان چلاور جھٹک کر دو ٹوک انداز میں بولے۔

”اوسے خانا! میرے تل سیدھی طرلاں بول۔“ تیری آپ جناب میرے پلے تب منیں پڑتی تھی جب جولائی کا طوطی بولتا تھا۔ اب الیس عمرے تو گھوڑے گھوڑوں سے کڑا کے بھی پتلی میں نکلتے ہیں۔“ برکت اللہ کی بات پر حسین احمد خان نے فوراً رخ پھیر کر مسکراہٹ چھائی تھی۔ آخر وہ پتلی سمجھ تو بخلی کہتے تھے۔ ایک لمحے کو تو بی چلا کہ جتا وقت اور جولائی لوٹ آئے اور وہ یونہی یکدم پلٹ کر ایک جست میں دیوار پر چڑھ کر ٹائیس لٹکا کے بیٹھ جائیں۔ پھر باتوں کا بھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے اور دن دھل جائے۔ دل بھیک سا گیا اور ایک نم سی آہ آنکھ میں جھنوکا مانند جھک اٹھی۔ مگر اگلے ہی بل برکت اللہ کے پتلے نے سارے جذبات جھاگ کی طرح بٹھا دیے۔

”کل سن خانا! اپنے منڈے کو ذرا تیز شیر سکھا، لگتا ہی نہیں نوابوں کی نسل ہے۔ شہزادہ

ہوے تے۔ اور اسے کہہ کہ ذرا میری کوٹھی دھج تاکا جھانک بند کرے۔ ورنہ برکت اللہ کو سننے کھینے ابھی بھی آتے ہیں۔ سمجھا!“

”ہمیں علم ہے اس بات کا برکت اللہ صاحب! آپ کے اسی وصف کے سبب تو آپ کو بتا کما جاتا تھا، ہم بھلا بھول سکتے ہیں۔؟“

ٹھہرے ہوئے بچے میں برکت اللہ پر چوٹ کر کے
حسین احمد خان نے اپنی گرم شمال کا پلو جھٹک کر
کندھے پر ڈالا اور ایک گہری نگاہ برکت اللہ کے غصے
سے سرخ چہرے پر ڈال کر بوجھل قدموں سے زینے کا
سرخ کیا۔



زینت بی ہال کمرے کی داہنی دیوار کے ساتھ بچھے
خوب صورت دیوان پر عملی گاؤں کیسے سے پہلو ٹکائے
بڑی نزاکت و نفاست سے کھٹے موڑ کر دونوں ٹانگیں
پارے بیٹھی تھیں۔ ہاتھ مہارت و مشاقی کے ساتھ
گرو شیا تھا اچھے ریٹیم کے پھولوں کی بنیت کرنے
میں مصروف تھے۔ قریب ہی چاندی کا منقش پاندان
دھرا تھا جو آج بھی جگر جگر چمکتا تھا۔ حالانکہ وہ پان کی
رسیا نہیں تھیں اسے یونہی قریب رکھ لیتی تھیں۔
کبھی کبھی دو چٹکی سونف پھانک لی اور بس۔ ایک
زمانہ نذر گیا تھا انہیں یہ بھولے ہوئے کہ وہ سماں اور
ٹھیکہ پنجابی ہیں۔ ان کی خوب اس قدر تبدیل ہو چکی
تھی کہ کسی نئے ملنے والے کو ان کے چہرے پہ چھائے
و قار اور تمکنت دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا کہ وہ جدی پشتی
نواب ہیں۔ یہ تو بس وہ جانتی تھیں کہ اس ”نوابی
لباؤے“ نے ان کے جذبات اور ان کی اولاد کا خون
چوس رکھا ہے۔ نواب زاوی عاتشہ اور نواب زادہ
شارق کا خیال آتے ہی ان کی انگلیوں کی رفتار سست ہو
گئی۔ آنکھوں میں پانی کی لکیر سی ٹھنچ گئی۔

ایک دم ہال کمرے کا داخلی دروازہ دھواڑے کھلا اور
غیض و جلال کی تصویر بنے ہوئے نواب حسین احمد
خان اندر داخل ہوئے۔ وہ فوراً ”سمجھ گئی کہ برکت
اللہ سے مناظرہ کر کے تشریف لا رہے ہیں۔

”یہ۔۔۔ یہ شخص۔۔۔ اس کی جرأت تو دیکھو۔۔۔
ہمارے خون پر ہمت باندھتا ہے۔۔۔ نواب حسین
احمد خان کے۔۔۔ ہمیں دھمکا تا ہے۔۔۔ اگر اس شخص
نے ہمارے نواسے احرار خان کی طرف میلی نگاہ بھی کی
تو ہم سچ سچ اس کی آنکھیں نکلوادیں گے۔ ہمیں کوئی

عذر مانع نہیں ہوگا۔“
صوفے پہ بیٹھے وہ مارے غصے کے ہانپ رہے تھے
۔۔۔ چہرہ آتش فشاں بنا ہوا تھا۔

”انہیں آج یہ مجنوں میاں بھی۔۔۔ کچھ ہوش کے
باخبر ان کو دلانے کی بھی ضرورت ہے۔۔۔ عشق کیجئے تو
گور کن کو بھی ہوسیار رکھیے یہ بلا جان لے کر ٹلا
کرتی ہے۔۔۔ اور ہم میں اب سکت نہیں کہ ہم بار بار
ایسا ہی جگر کلٹ کر دھاتے رہیں۔۔۔ ہم تھک گئے ہیں۔
تھک گئے ہیں ہم بیٹیں ڈھوٹے ڈھوٹے۔!“ وہ بے
دم سے ہو کر صوفے سے سر نیک کر اکھڑے اکھڑے
سے سانس کھینچ رہے تھے۔ زینب بی کے ہاتھ پاؤں
پھولنے لگے۔ جھٹ سے پانی کا گلاس منہ کو لگایا۔
چند کھونٹ پانی کے حلق میں اترے تو آنکھیں موند کر
خود کو پرسکون کرنے لگے۔

”گپ کیوں برکت بھائی کے منہ لگتے ہیں۔۔۔
جانتے بھی ہیں کہ ان کی عادت ہے آپ کو چڑانا۔۔۔ اور
آپ چڑ جاتے ہیں۔ ہم بات کریں گے حاجرہ آپا سے
۔۔۔ وہ سمجھائیں گی انہیں۔۔۔ آپ فکر مت کیجئے۔
کیسے تو عاصم (ملازم لڑکا) سے کہہ کر ڈاکٹر صاحب کو
بلواؤں۔“ زینب بی نے فکر مندی اور محبت کے ساتھ
شوہر کے ماتھے پہ ہاتھ دھرا۔

”نہیں۔۔۔ ہم اب بہتر ہیں اب بھی ہم میں اتنا
غم ہے کہ ایک کے جواب میں دس کہہ سائیں۔
ذرا اعصاب ٹھکانے آئے تو نواب صاحب کا طفلہ بچہ
ٹھکانے پر تشریف لے آیا۔ زینب بی نے سکون
سانس لیا اور دھیمسا سا سکرادیں۔ انہیں بھی اس جگہ
ہوئی رسی کے بل بے حد عزیز تھے۔

”بس آپ احرار کو سمجھا دیجئے۔۔۔ حرم بی کا خیال

نکال دیں دل سے ورنہ اب کی بار جو سرخ آندھی چلا
تو سب اندھے ہو جائیں گے۔ نفرتوں کی میٹھی سم
کی آنکھیں پھوڑ دیں گی۔!“ زینب بی نے دہل کر کہا
تھام۔۔۔ وہ ایک ٹک نواب حسین احمد خان کے چہرے
تکے جاری تھیں۔ جس پر کچھ ٹھوہنے کا ہراس غم

فوزیہ پھوپھو کو ٹھنڈا لگ گئی۔ فلو، بخار اور ساتھ میں کچھ دواؤں بھائیاں خدمت میں پیش پیش اور وہ خود تین تین جوڑی موزے۔ سر پر گونگلو سے ادھار لیا ہوا موٹا اونٹن لپٹا اور اس کے اوپر سٹال۔ جس کے ساتھ ناک اور منہ ڈھک رکھے تھے۔ دو جریاں بھی نصب تن کی ہوئی تھیں۔ یعنی کہ کل ملا کر فوزیہ پھوپھو کے وزن میں دس کلو کا اضافہ تو ہو ہی گیا ہو گا۔ یہ سب پسینہ اور ٹھنڈا کر دہرا سی دھوپ نکلنے پر باہر صحن میں کرسی ڈال کر بیٹھ گئیں۔ بے جی کے پلنگ سے لڑنا لگ رہے۔ دونوں کی بات چیت بند تھی۔ محض لڑنے کے فائدہ دیتی تھیں بوقت ضرورت!

بے جی کو ابھی تک کل والی بات پر غصہ تھا۔ اور نئی بار تنبیہ کر چکی تھیں کہ فوزیہ پھوپھو اس رشتے کا اگر میاں جی کے سامنے نہ کریں مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک تھیں۔ بے جی کو کھرا جواب دیا تھا کہ وہ یہ رشتہ کروا کر رہیں گی۔ اب یہ محض اتفاق تھا کہ رات ہونے والی بارش نے موسم کی خشکی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور سرشام ہی فوزیہ پھوپھو کو ہونے والے نزلے زکام میں بھی برکت پڑ گئی تھی۔ رہی سہی کسر بخار نے پوری کر دی ورنہ وہ رات ہی میاں جی کے ساتھ بیٹھ جاتیں۔ اب دھوپ سینکتے ہوئے اور بے جی کی مسلسل خود پر پڑتی تیز چبھتی نگاہیں نظر انداز کیے۔ ان کا دھیان لیٹ کی طرف لگا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی میاں جی آئیں گے وہ انہیں ہمیں لے کر بیٹھ جائیں گی اور ہاں کروا کر انہیں گی۔ آخر کو ان کے سسرال کا معاملہ ہے۔

بے جی گونگلو کے سر میں تیل کی مالش کر رہی تھیں۔ اسے آج اسکول سے زبردستی چھٹی کروا دی تھی۔ یہ نکلے بے جی کو اس کا پیڑا گرم گرم لگ رہا تھا۔ گونگلو ہاں کو بھی ہمانہ مل گیا۔ وہیں تخت پر بستر پھینک کر

بے جی کی نظریں فوزیہ پھوپھو پر بھی نکی تھیں۔ جو کبھی نزاکت سے دواؤں کے ساتھ اپنی پیشانی مسلتیں تو کبھی روہاں سے ناک صاف کرتیں۔ بے جی کے حملے کے جواب میں انہوں نے اپنی چلتی آنکھوں کو بمشکل کھول کر بے جی کو گھورا اور جوانی فائر و آغا۔

”آپ جو بھی کہیں ہے جی۔! آج ہی وائٹر کا وائٹر اور ملک کا ملک ہو جائے گا۔ دیکھتے ہیں میاں جی کیا پلائی کرتے ہیں مجھے۔! بے جی کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے تھے۔ ایک تو فوزیہ پھوپھو کے انگریزی ٹانگے ان کے لیے نہیں پڑتے تھے۔ اور سے جواب بھی تفصیلی ہوتا تھا۔ قریب سے ہی اور گیس بھائی کی پیگم ٹوپیہ پھورے رنگ کا ڈبل پلائی والا کمبل لے کر زور رہی تھیں۔ بے جی نے غصہ دہاتے ہوئے اسے آواز دی۔

”نی ٹوپیہ۔! تو پیہ بھابھی بے جی کی پکار سن کر آدھ کھلے منہ کے ساتھ مستعد سی انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھتی کھڑی ہو گئیں۔

”پت منہ بند کر۔ نہیں تو (دانت) گر جائیں گے۔ تے ٹالے اے کمبل اپنی پھوپھو فوزی دے اتے پا دے۔! تو پیہ بھابھی نے سختی سے ہونٹ بھیج کر۔ فوزیہ پھوپھو کے نہ کرنے کے باوجود انہیں ذہنی کمبل اوڑھا دیا۔

”چل۔! ایس انگریزی پترواؤ سکن (منہ) تے بند ہویا۔! بے جی گونگلو کے سر میں باریک سٹیکھی پھیرتے ہوئے بڑبڑا رہی۔

اتنے میں میاں جی ہاندر آئے۔ دھیمی چال چلتے ہوئے فوزیہ پھوپھو کے بالکل ساتھ والی کرسی پر آکر ٹک گئے۔ نظر ساتھ والی کرسی پر ڈالی اور کمبل کے پھولے ہوئے حصے پر زور دار چھکی دے کر بولے۔

”ٹالے کن رچھو داچہ اے۔؟“

اتنے میں فوزیہ پھوپھو نے زور دار کراہ کے ساتھ

بڑی مشکل سے لمبل میں در زوہونہ کر منہ باہر نکالا۔
میاں جی بے چارے کھسکے سے انہیں دیکھتے چلے گئے۔

”اف، میاں جی! آپ کا پنڈ ہے کہ ہمو (ہتھوڑا)۔ میرے پنڈ (سر) کا سرمہ بنا دیا۔ اتنی مشکل سے ذرا سی اونگھ آئی تھی۔ آپ نے سب ڈسٹرائے کر دیا۔ اف اللہ! فوزیہ پھوپھو اپنی زکام زدہ آواز میں کر لائیں۔ میاں جی پکپکارتے ہوئے بولے۔
”نہ میرا پتہ۔! مجھے کس سیانے نے مشورہ دیا تھا“
اتنا دوا کمل اونٹھ کر بیٹھنے کا۔ غی سی کرسی ہے۔ شکر کر، تجھے سہارا ہوا ہے اس نے اوپر سے تو نے سوا من کا کمل بھی ٹٹلی پلا دیا۔“

”آپ بھی۔ آپ بھی میاں جی اپنی ڈانٹر کو ایسا کہہ رہے ہیں اگر آپ نے مجھے لٹ کتنا ہے تو بانی سب کا ماوتھ میں بھلا کیسے کھڑ کر سکتی ہوں۔ پہلے ہی یہاں آتے ہی مجھے سائیٹ (نظر) لگ گئی ہے۔ ابھی بھابھی کو کہتی ہوں کہ مجھ پر سے چمچ (مرچیں) داریں“
فوزیہ پھوپھو ٹاک پوچھتے ہوئے بیگم جمل گو آوازیں دینے لگیں۔ وہ بھی جیسے تیار بیٹھی تھیں۔
بول کے جن کی طرح ہاتھ میں سات مرچیں پکڑے حاضر ہو گئیں۔ بڑے جوش اور شوق سے مرچیں وارے ہوئے خوشی سے ان کا چوہو بھی لال مرچ بنا جا رہا تھا۔

میاں جی جو بڑی کینہ توڑ نظروں سے یہ منظر ملاحظہ کر رہے تھے۔ فوراً بولے۔
”داری جاؤ تے اجاڑی جاؤ۔ اے دڈی نو (بڑی بھو) جتنی مرچیں تو داروار کے چوڑے میں جھونکتی ہے نا۔ کسی دن شرمیں مرچاں کا کال (قسط) یاد رہا ہے تو نے“
انہوں نے مرچیں قریب رکھی آنکھیں میاں جی جھونکتی تھیں۔
میاں جی غصے میں کھانٹتے ہوئے اندر چلے گئے۔

بے جی کا متوقع صورت حال کے تصور سے ہی ہنس ہنس کر حشر ہو چلا تھا۔ اور پھر اگلے چند لمحوں میں ہی

برسی طرح کھانستی ہوئی فوزیہ پھوپھو نے ایک جھٹکے سے کمل الٹ دیا۔ زکام اور بخار نے پہلے ہی مت مار رکھی تھی۔ اب مرچوں کی دھانس نے چوہا آتش فشاں بنا دیا تھا۔

”بس کر دیں بھابھی۔ بس کر دیں۔ اب تو کھانٹ کر کھانٹ کے میرا دل اوپر حلق میں چڑھ آیا ہے!“ لال ہوئی ہوئی آنکھوں کا پانی صاف کر کے فوزیہ پھوپھو نے بمشکل جملہ پورا کیا۔

بے جی نے ایک حیز نظر فوزیہ پہ ڈال کر سکون کا سانس لیا کہ کم از کم ابھی کے لیے وہ اس قاتل نہیں رہی تھیں کہ میاں جی کے سامنے اپنے جیٹھ کے رشتے کی بین بجاتیں۔ مگر کب تک؟ اس سے پہلے ہی انہیں کوئی قدم اٹھالینا چاہیے۔ انہیں اب جلد از جلد نہ سنبلی سے بات کرنا تھی۔



عمیس لاؤنچ میں داخل ہوا تو وہاں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا، صرف وہ اپنی دیوار کے آخری صوفے پر کینڈی لون سلانیائیں تھامے کچھ بننے میں مگن تھی۔ آج کل وہ بے جی سے سیکھ کر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ شوق تھا اس لیے جلدی سیکھ رہی تھی۔ اے جلد بلی آواز میں ٹی وی پر کوئی ڈرامہ چل رہا تھا۔ یعنی کہ ماحول بے حد سازگار تھا۔ عمیس کی باجھیں چمک رہیں۔ یکدم اس کی شاعرانہ رگ پھڑک پھڑک کر اے اکسانے لگی۔ اس نے دیر سے کھینکھا کر گلا صاف کیا۔ کینڈی یونی مگن ہی بیٹھی رہی حالانکہ وہ عمیس کی موجودگی سے باخبر تھی۔ وہ چند قدم چلن ہوا آگے آیا اور سب سے اگلے صوفے پر اچھلن ہوتے ہوئے آواز میں بھاری پن پیدا کرنا ہوئے بولا۔

”عرض کیا ہے۔“
”تھالیں کہ انہیں می یہ راتیں کبھی۔“

کینڈی نے اک ادا سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور بایاں ابرو اچکاتے ہوئے بولی۔
 ”اچھا جی۔۔۔ اس کا انداز دیکھ کر لمبے بھر کو تو ہمیں پٹا گیا گرا گلی ہی بل وہ پھر سے پراعتما تھا۔
 ”تھالیں کہ آئیں گی یہ راتیں۔۔۔ تم سے ”نانا کے گھر“ میں ہوویں گی ملاقاتیں کبھی۔“

”واہ واہ۔۔۔ کینڈی نے سلاخیوں کو اون کے گولے میں تھپڑ اور دونوں مٹھیاں ٹھوڑی پر جما کر پوری طرح عمیس کی طرف متوجہ ہوئی۔ نگاہوں میں اشتیاق کا سمندر اٹھا اٹھا مارنا کھائی دیا عمیس کو اور کور کش بجالایا۔
 ”آداب عرض ہے۔ آداب عرض ہے۔۔۔“
 ”مگر آپ نے تو شعر عرض کیا تھا۔ عمیس بھائی۔“
 کینڈی نے معصومیت سے عرض کیا۔
 ”حق۔۔۔ اشاعر شاعر ہوتا ہے نگلی۔ بھائی نہیں ہوتا۔۔۔ بھائی کہنے سے شاعرانہ ”ظلمات“ مرہ ہو جاتے ہیں۔“
 عمیس نے جھنجھلاہٹ چھپاتے ہوئے ناسخانہ انداز میں کہا۔
 ”یوں کہیں نا۔۔۔ کہ شاعر کو بھائی کہہ دو تو اس کا دل کھائی میں کودنے کو کرتا ہے۔ ہا۔۔۔ کینڈی زور دار تلی مارتے ہوئے ہنسی۔ عمیس نے وانت کچکا پائے۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ یعنی تم سنجیدگی نہیں میرا کلام سننے کے لیے۔۔۔ وہ مصنوعی دل گرفتگی سے اٹھنے لگا۔
 کینڈی فوراً سے پٹھر بولی۔
 ”ارے! ایسا ہرگز نہیں۔ آپ کا کلام سننے کے لیے تو مشتاق بیٹھے ہیں۔۔۔“
 ”ہائیں۔۔۔ اوہ تیری۔۔۔ عمیس ڈوڈو کی مانند یکدم اچھلا تھا۔ سر اسیمہ سا پورے لاؤنج میں نظریں گھمانے لگا۔
 ”ک۔۔۔ کہاں ہیں مشتاق صاحب؟ بھلا پہلے بتاؤ کہ یہاں کوئی مشتاق صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔ حد کرتی ہو کینڈی بن۔۔۔“ جو تے پڑنے کے خیال سے

”مان گئی آپ کا جگرا۔۔۔ ایک پل میں جس کے ساتھ عشق جھاڑا جا رہا ہو۔ اگلے ہی پل اسے آپنی باجی بکارنے کا فن آپ کو بخولی آتا ہے۔ واللہ! میں تو آپ کی شاگردی اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں!۔۔۔“ طنز کے شیرے میں ڈوبی مصنوعی عقیدت کا اظہار کرتی کینڈی کا اعتماد دیکھ کر عمیس سچ بچ بکھلا گیا تھا۔
 ”وہ تو میرے منہ سے اچانک نکل گیا تھا۔ اصل میں کینڈی۔۔۔“ بھرپور سنجیدگی کا تاثر لیے نگاہیں اس پر جمائیں۔ ”میں نہیں چاہتا کہ تمہاری محبت کا جوچ میں نے اپنے دل میں بویا ہے۔۔۔ اس میں سے کوئی پھوٹنے سے پہلے ہی کوئی اسے نوچ ڈالے۔“
 ”آں۔۔۔ ہاں!“ کینڈی نے مزہ لینے والے انداز میں ہونٹ سکڑے۔
 ”اچھا آپ کوئی کلام سنا رہے تھے اپنا۔ سنائیے نا۔“

”ارے ہاں وہ اصل میں مشتاق کے چکر میں ذہن سے ہی نکل گیا۔ لو پھر عرض کیا ہے۔“
 ”ہم بھول گئے رے ہر بات۔ مگر تیرا پیار نہیں بھولے۔“
 تمام رات ہوتی رہی برسات۔ مگر تیرا پیار نہیں بھولے۔“
 پرانے پاکستانی گانے کا ولیہ بنا کر عمیس اب ولو طلب نظروں سے کینڈی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے چہرے پر واضح طور پر بائیں کا تاثر تھا۔ اس نے دھیرے سے کھنکھار کر بالائی لب پر انگلی نکاتے ہوئے کہا۔
 ”آپ تو بہت مہمان ہیں عمیس بھائی۔ آپ کا

ہم نے کہا ”یہ بھی بول ساری عمر ہی کو رلاؤں گا“

بے حد دل گرفتگی سے کینڈی نے آنکھیں میچے ہوئے کہا... سڑکی دہائی کی ہیروئن کی طرح لہرا کر آنکھوں پر دوپٹے کا پلو بھی دھر لیا۔
عمیس کی پٹاری میں ابھی چار مصرعے مزید تھے اور وہ پورے فارم میں بھی تھا۔ جب پیچھے سے یکدم میاں جی نے شاندار انٹرویو دی۔
”چھوڑنا پڑا۔ ایدر آ۔“

کینڈی تو کھوں میں نو دو گیارہ ہو گئی۔ میاں جی کے ہاتھ میں عمیس کی پٹلی اور بی گرون آگئی تھی۔ اس کے بعد عمیس آگے آگے اور میاں جی ہاتھ میں اپنا چمڑے کا کھسہ لیے پیچھے پیچھے! تاک تاک کے نشانے یہ مارا تھا۔ اور پھر شام تک جب جب چوٹیں سہلائے عمیس کے منہ سے دہائی نکلتی تب تب وہ اپنی سات پشتوں سمیت تک بندریوں سے نائب ہوتا رہا تھا

گو نگلو کو اسکرین الرجی ہوئی تھی۔ سارے جسم پر چھوٹے چھوٹے باریک دانے سے نکل آئے تھے۔ چٹا گورا گو نگلو اس وقت لال چھندر ہوا جا رہا تھا۔ بخار الگ کسر پوری کر رہا تھا۔ بے جی کی تو ویسے ہی اس میں جان ابھی تھی۔ ہتھیلیاں مثل مثل کروا دیا کیے جا رہی تھیں۔

”آئے ہائے! ہو رہے کدی نظر لگ گئی میرے گو نگلو نو۔ سارا پنڈا (جسم) پتہ پتہ ہو گیا منڈے دا

بھجی کی دہائی تب تک جاری رہی جب تک حرم کالج سے گھر نہیں آگئی۔ گھر کے مردوں کے آنے میں ابھی تاخیر تھا اور بے جی جانتی تھیں کہ میاں جی نے محض گو نگلو کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے وقت سے پہلے کسی لڑکے کو گھر روانہ نہیں کرنا۔ اور جوئے کھانے کے بعد تو عمیس بھی باقاعدگی سے فیکٹری دا

کلام تو آپ کی پیدائش سے کئی دہائیاں پہلے ہی چوری بھی ہو گیا۔ دھت تیرے کی۔“
اپنے ہی سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

عمیس نے فخر سے سینہ پھلایا اور بات کی تہ میں پہنچے بھائی بڑھک ماری۔

”اف! دل نو چر آیا تھا۔ جگر بھی لے اڑیں ظالم صرف تم نے ہی میرے کلام کی قدر پہچانی ہے۔ ورنہ ایک دہائی تو مجھے بھی ہو گئی کتنے ہوئے کہ میرے الفاظ چرائے جا چکے لوگو۔ خدا را کوئی تو سنو۔ مگر بوانے کی بڑبڑ کون کون کلن دھرتا ہے!“ عمیس نے مصنوعی تاسف سے آنکھیں میچ لیں۔ کینڈی کو یکدم شرارت موجھی۔

”عمیس بھائی ایسی ہلکی پھلکی تک بندیاں تو میں ناچیز بھی کر لیتی ہوں۔ تو کیا خیال ہے ہو جائے کچھ فی البدیہہ۔“

”ہیں۔ کون سی وہی۔؟“ عمیس نے تھوک نکل کر پوچھا۔

”وہی کدھر جی ابھی عمیس بھائی۔ چلیے نا“ موقع بھی ہے۔ دستور بھی۔ کچھ آپ کہیے کچھ ہم سناتے ہیں۔ ذرا داؤ پیچ آزماتے ہیں؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ (مر گیا عمیس) جی جی میں عمیس کر لایا۔ کینڈی کے بھرپور جوش کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک لمبا اور ٹھنڈا سانس کھینچا اور اتر آیا میدان میں۔ ”آریا پار۔ بیٹا جتنے شاعر نظر سے گزرے ہیں سب کا گھونٹا لگا دے۔ ورنہ ورنہ عزت کی چٹنی بن جائے گی۔“ اندر ہی اندر خود کو دلاسا دیتے ہوئے عمیس ہٹل نے آنکھوں میں غبار بھرتے ہوئے پہلے عرض کیا۔

”ہم۔! میں نے کہا۔ تم سے بہت پیار ہے۔“

”آہاں! ہم نے کہا۔ تو ہی تو دلدار ہے۔!“
میں نے کہا ”دھوم دھام سے لے کر بات اپنی جاؤں گا۔“

رہا تھا۔ لہذا کسی کو فون کر کے بلاتیں بھی تو آتے آتے ہی چار گھنٹے لگا دیتے۔ اس لیے جیسے ہی حرم گھر پہنچی، بمشکل اسے منہ پہ دو چھینے مارنے کی اور منہ میں دو نوالے ڈالنے کی رعایت ملی تھی۔ بے بسی نے کونگلو کا بازو پکڑا۔ سر پر قہر نکالیا۔ کو فون نہ کر سکی حرم بمشکل ساتھ چلنے پر راضی ہوئی تھی۔ وہ تو شکر تھا کہ اور بس بھائی کی کٹس گھر میں ہی کھڑی تھی اور حرم ڈرائیو کرنا جانتی تھی اس لیے جلد ہی ہی کلینک پہنچ گئے۔ اسکن اسپیشلسٹ کے کلینک پر رش بے تحاشا تھا اور ڈاکٹر غائب۔! تو کن لے کر حرم فرصت سے ویٹنگ روم میں آکر بیٹھ گئی۔ بے جی اور کونگلو کے برابر۔! بے جی بڑی محبت سے مریضوں کی آکٹائی ہوئی شکلوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ حرم جانتی تھی کہ ان میں سے ہی کسی مریضہ کے ساتھ اگلے پندرہ منٹ میں بے جی دوستانہ تعلقات استوار کر کے اس کا شجرہ نسب تک جان لیں گی۔ حرم نے سر پر اوڑھی چادر کو کھینچ کر ناک تک آدھا چہرہ ڈھکا اور سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔ اس پر غصہ کی طاری تھی یا شاید واقعی وہ سو گئی تھی جب بس کے حواس یک دم بے جی کی قدرے اونچی اور مختصر سی آواز پر بیدار ہوئے۔

”لے دس! میرے بالوں سال گھنڈ چھوٹی ہوئی۔ تے میتوں لماں جی کھندی اے جی۔ تیرے تے سارے دند (دانت) ڈگے پئے۔ پچھلے (پھولے) شاپر درگا تیرا منہ اے۔ میرے وات (دہانہ) اندر رب دا شکر پورے ست (سات) دند تے چار داڑھاں (داڑھیاں) سالم دیاں سالم مہجود نے۔ ووئی آئی تو مہور چھنی (کاکی مٹی)۔!“

حرم بے چاری بوکھلا کر بے جی کو چپ کرانے کے لیے ٹوکے دیے جارہی تھی۔ اسے پوری بات تو نہیں سمجھ سکی۔ بے جی کے فکروں نے اسے بخوبی باور کرا دیا تھا کہ سامنے والی کرسی پر غصے سے بیڑیا کی خاتون نے ”ہٹا“ بے جی کو بزرگی کی سند عطا کرنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں بے جی نے جواباً ”ان خاتون کے نشوں کے پتے لگا دیے تھے۔ ادھر کونگلو غارخ کر کر

کے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ اس نے قدرے بے بسی کے ساتھ کلینک کے داخلی دروازے کی طرف نگاہ کی۔ عین اسی لمحے ڈاکٹر کی آمد ہوئی۔ حرم نے شکر کا کلمہ پڑھا اور بے جی کو متوجہ کیا۔

”بے جی۔ اب بس کریں، انھیں جلدی ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں۔“

”ہن آیا اے ٹ پتا۔ میرا دل ہٹا کر دالے کہ کوئی (کسی) مار کے ایذاں ناساں (ناک) بن دواں۔ شجر جیانہ ہووے تے۔!“ بے جی تو مزید ٹپٹس میں آ گئی تھیں۔ سارا غصہ انہوں نے ڈاکٹر پر نکالا تھا۔ ارد گرد بیٹھے مریض دبی دبی ہنسی ہنس رہے تھے۔ محفوظ ہو رہے تھے۔

اللہ اللہ کر کے ان کا نمبر آیا تو تینوں اندر چلے گئے۔ کونگلو کو پشیمٹ اسٹول پر ٹکا کر حرم خود اس کی تکلیف کو تفصیلاً بیان کرنے لگی۔ ڈاکٹر بلال حرم کو دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔ نظریا بارہمک کر کونگلو کے بجائے اس کے حسین چہرے پر آگئی۔ جبکہ بے جی بالیاں ابھرا چکائے نظر کے موٹے چستے کے پیچھے سے مسلسل ڈاکٹر بلال کو کینہ توڑ نگاہوں سے نکتے جاری تھیں۔

ڈاکٹر بلال نے کونگلو کا معائنہ کیا اور نسخہ لکھنے سے پہلے استقبالیہ انداز میں حرم کو دیکھتے ہوئے کونگلو کا نام پوچھا۔

”ایدا تاں کونگلو!“ جواب بے جی کی طرف سے آیا تھا۔

”نہیں لماں جی! پیٹ نیم نہیں اصل نام!“ ڈاکٹر بلال نے نرمی سے بے جی سے پوچھا۔

”تاں تے میں تینوں کدوں اووے ہڈ (پیٹ) وانا پ دیا اے۔ آکھیا تے ہے کونگلو۔ کونگلو۔!“

بے جی نے نظروں ہی نظروں میں حرم کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بے جی سے ڈاکٹر بلال کو جواب دیا۔ ڈاکٹر بلال نے ٹھنڈا سا سانس بھرتے ہوئے پوچھا۔

”والد کا نام۔“

”اجمل۔“ جواب پھر بے جی نے ہی دیا۔ حرم

مارے شرمندگی کے سر جھکائے بیٹھی تھی۔
 ”پیشنٹ کا نام۔۔۔ گو نگو! والد کا نام۔۔۔ اجمل! یعنی
 کہ گو نگو! اجمل۔۔۔ ہا! ہا۔۔۔ یہ تو بڑی فنی (مزاحیہ) سی
 بات ہے۔“ ڈاکٹر بلال نے بڑی میٹھی نظروں سے حرم
 کو دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا۔

اس کی حرم کو تاثراتی نظریں دیکھ کر بے جی دوبارہ
 طیش میں آ گئیں۔

”میں اک چھوٹا ماری اے“ تیری ساری فنی خرابی
 نکل جانی اے۔ ڈاکٹر بہن! شہود اندہ بن۔۔۔“

اب کے ڈاکٹر بلال کے چوہہ طبق روشن ہوئے
 تھے۔ اس نے عافیت اسی میں جانی کہ خاموشی سے نسخہ

لیکھے اور ہاتھ میں تھمائے ورنہ ان بزرگ خاتون سے
 کوئی بعد نہ تھا کہ باہر بیٹھے مریض بھی اس کی اس
 عزت افزائی کو لایو ملاحظہ کرتے۔

بے جی۔۔۔ حرم اور گو نگو کے ساتھ گھر پہنچیں تو
 فوزیہ پھوپھو آگے پہنچانیت لگائے میاں جی کو گھیرے
 بیٹھی تھیں۔ بیگم جمال اور بیگم اجمل بھی قریب ہی
 براجمان تھیں۔ کیڑی ابھی ابھی چائے بنا کر لائی تھی
 اور سب کو کپ پکڑ رہی تھی۔

بے جی پہلے ہی آگئی ہوئی تھیں۔ یہ تماشا دیکھ کر
 تو ان کا جی چاہا کہ فوزیہ پھوپھو کی گردن موڑ دیں۔ بے

جی نے برقعہ اتار کر حرم کو پکڑا اور آستین چڑھائی
 میدان میں اتر آئیں۔ پھر تو وہ ٹھہسان کا دن پڑا کہ

کل بڑی آواز سنائی نہ دی۔ صرف بے جی کی پنجابی
 اور فوزیہ پھوپھو کی انگریزی ایک دوسرے سے سر

نکراتی، پاش پاش ہو کر فضا میں گھبر رہی تھیں۔ میاں
 جی بیٹھے مزے سے سردھنٹے ہوئے چائے کے گھونٹ

بھر رہے تھے۔ انہیں عورتوں کی لڑائی دیکھنے میں
 لطف بہت آتا تھا۔ بیگم جمال کہیں اور اندر سے

مرچیں پکڑ لائیں۔ دونوں ماں بیٹی پر سے وارنے
 لگیں۔ ان کے خیال میں کسی کی بد نظری تھی جو
 ماں بیٹی لڑ رہی تھیں۔ بے جی نے چڑ کر بیگم جمال کا

ہاتھ پرے جھٹکا۔ ”پراں کروڑی! تے مچاں دی
 بجائے پھوڑی نو چلے (چولے) کو چپا دے۔“
 فوزیہ پھوپھو کو توپختے لگ گئے۔ میاں جی کو دیکھتے
 ہوئے بولیں۔

”آپ سکون سے ٹی ڈرنک کرس میاں جی۔۔۔ اور
 ادھر بے جی مجھے اسٹوڈ میں تھرو (چھیننا) کر کے فائر

لگانے کا بول رہی ہیں۔ بس۔۔۔ لہنف ہو گیا۔ میں نے
 مسٹر ارشد کو فون کر دیا ہے، پرسوں فرائیزے (جھج)

پڑھتے ہی نکل پڑیں گے۔ اور اب میں گئی تو آپ کو
 مجھی بھی اپنا ٹیس نہیں دکھاؤں گی۔ ایک پروپونل

ہی تولائی ہوں اپنی بیٹی کے لیے۔ کیا۔۔۔ ہے جو
 ایک سیٹ کر لیں!“

فوزیہ پھوپھو نے شال کے پلو سے آنکھیں رگڑ رگڑ
 کر سرخ کر لی تھیں مگر آنسو ایسے ڈھپٹ تھے کہ شاید

آنسو گیس کی شینگ ہوئی تو نکل ہی پڑتے۔
 ”او پھوڑی پتر۔۔۔ اجنبانی نہ بن۔۔۔ سوچنے کے لیے

قیم تو دے!“ میاں جی رساں سے بولے۔ اس دوران
 بے جی اب آرام سے بیٹھی۔ فوزیہ پھوپھو کی چائے

والا کپ تھامے سرد سڑکی آواز کے ساتھ بے جا رہی
 تھیں۔ چہرے پر سکون تھا کیونکہ ان کی بھڑاس نکل

چکی تھی۔ اور میاں جی کے تاثرات سے بھی وہ انداز
 کر چکی تھیں کہ انہوں نے کوئی خاص دلچسپی نہیں دے

تھی اس رشتے میں۔ یہ بات خاصی طمانیت بخش تھی
 دیوار پار اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑے احرار

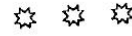
بے ساختہ شکر کا کلبہ بڑھا تھا۔ میاں جی کے چھکے
 سینے بولے نے اس کی ٹس ٹس میں خوشی بھردی تھی

کم از کم ہارون نائی بلا تو سر سے نلی تھی۔ احرار
 میاں جی یہ ڈھیروں پیار آیا۔ اس کی نظروں کی

حرارت تھی کہ میاں جی نے چونک کر سر اٹھایا اور ٹکا
 ٹیس میں کھڑے احرار کی نگاہ سے ٹکرائی۔ اسے

یکدم شرارت سو جھی اور میاں جی کی طرف فلاںک
 کس اچھالتا، بھر پور ہنسی ہنستا رہے ہو گیا۔ میاں جی
 نے سٹپٹا کر سب کے چہرے دیکھے۔ کوئی بھی متوجہ

نہیں تھا۔ وہ شکر ادا کرتے ہی جی میں بیڑا لے۔
”خچر دا پتر۔“



دیوان خاص میں وحشت بھری خاموشی چھائی تھی،
... یوں جیسے ابھی ابھی میت اٹھی ہو اور پیچھے محض اس
کاسوگ و بھیسی و بھیسی سکریاں بھرتا ہو۔ بے حد اونچی
چھت اور خوب صورت شیشوں سے مزین روشن
دالوں والا یہ کمرہ پرانی طرز تعمیر پر مشتمل جدید
آسائشات سے لیس تھا۔ وسط میں لگتا فانوس اور
اس کا جگر جگر کرنا کچھ۔ روشن دان سے آتی سورج کی
کریں پرنے کی وجہ سے نگاہوں کو دکھائے دے رہا تھا۔
یہاں موجود نوبلی طرز کا بھاری بھر کم فرنیچر اس کی
شان و شوکت میں اضافے کا باعث تھا۔
اس وسیع و عریض دیوان خاص کی سفاک خاموشی
میں ضبط و غضب چھلکانی شخصیت نواب ترک
حسین خان کی بھی۔ مارے طیش کے نوبلی رنگت ملاوا
اکل رہی تھی۔

”ہم۔۔۔ تو آخر کار زمین نے نواب حسین احمد
خان کو اگل ہی دیا۔ ہونہ وہ ہمیں کیا سمجھتے تھے اگر وہ
آسمان کی وسعتوں میں بھی چھپ جاتے تو وہاں سے
بھی ہم ہاتھ برہا کر انہیں نوج لاتے۔۔۔ چھبیس سال،
پورے چھبیس سال ہم نے اپنے پوتے کو ڈھونڈا ہے۔۔۔
ہماری عمر بھر کی کمائی تھی وہ۔۔۔ ہمارے فرزند نواب
راہہ طلال حسن خان کی نشانی۔ جس طرح ہمنوں نے
اسماعیل نمک حرام (کو جوان) کے ذریعے ہماری ناک
کے نیچے سے ہمارا چوٹا غائب کروایا تھا۔ ٹھیک ویسے ہی
ہم حسین احمد خان کی نگاہوں کے سامنے اسے لے کر
آئیں گے۔ ہم شب خون نہیں ماریں گے۔
ہمارے جانے کے انتظامات مکمل کرواؤ شیرا گلن۔۔۔
ہمیں جلد از جلد پاکستان پہنچنا ہے اور اپنے پوتے کو
ہمارے طعمران کے ساتھ اس محل میں لانا ہے۔ وہی
ہمارا اصلی وارث ہے۔۔۔ چلنے کی تیاری کرو شیرا گلن
۔۔۔ اب ہم مزید تاخیر نہیں چاہتے۔“

دودھ یا سفید مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے انہوں نے
ایرو اچکا کر اویڑ عمر شیرا گلن اور اس کے جواں سال
بچے زرونی کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ دونوں
جان کی لٹن پائے پر جی جی میں شکر بجالاتے ہوئے
سر جھکائے اٹے قدموں واپس ہو گئے۔ آج کئی
سالوں کی مشقت کے بعد شیرا گلن اس محل کے
وارث کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس سے
پہلے اس کا باپ اسی مہم میں ناکامی کے باعث نواب
صاحب کے عتب کا نشانہ بنا اسے معلوم ہو ہی گیا کہ
پاکستان میں نواب حسین احمد خان اپنے نواسے اور
نواب تبرک حسن خان کے پوتے کو لے کر کس
علاقے میں روپوش ہیں۔ اور اب یہ خوش خبری نواب
صاحب کو دینے کے بعد کم از کم اسے بھوکے تیر کے
آگے نہیں ڈالا جانا تھا۔۔۔ وہ سرعت کے ساتھ
محل سے نکلا تھا اور اب اسے اگلے انتظامات کرنے
تھے۔

نواب تبرک حسن خان، اپنی جگہ سے اٹھے اور
ہیروں جڑی چھڑی کا دستہ مضبوطی سے تھام کر سب سے
چلتے کمرے کے سب سے تاریک گوشے تک چلے
آئے۔ باقی ماحول سے کٹ کر اور ہٹ کر بنے اس
اندھیرے اور ٹھنڈے حصے میں ایک بے نام سی
وحشت اور سوگواریت طاری تھی جیسے دیوار پار کوئی
زندہ لاش بچکیاں لیتی ہو۔ نواب تبرک حسن خان
نے ایک چھوٹا سا عین دیا۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ
دیوان خاص سے متصل اس گوشے کی قدرے نیچی
چھت پر لگے یلو اسپاٹس جل اٹھے۔ تبرک حسن خان
مسکرا دیے۔ سامنے زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور
طلال حسن خان کا ہوشربا اور جاندار پوزٹریٹ پوری
شان سے آویزاں تھا۔

”کتنّا حسین ہے یہ چرو۔!“ نواب تبرک حسن
خان نے گہری سانس بھرتے ہوئے سوچا۔

ہلکے بھورے چمک دار بال، اونچی پیشانی، روشن
آکھیں، کھڑی ناک اور بھرے بھرے گالوں کے
ساتھ وہ ایک مکمل شاہکار تھا۔ بے عیب بھرپور مرد،

ہو گئی تھیں کیونکہ ان کے شوہران پر پہلے سے زیادہ فریفتہ ہو گئے تھے۔ آخر کو اب ساری جائیداد اور محلات رومانہ کا مقدر تھے۔ مگر فی الوقت بازی الٹ گئی تھی۔ جس گھڑی سے نواب تہرک حسن خان کو اپنے پوتے کی اطلاع ملی تھی گویا ان کے کھنڈر وجود میں زندگی نئے سرے سے جاگ اٹھی تھی۔ وہ ابھی اس محل میں آیا نہیں تھا مگر انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے پوتے کی شادی رومانہ کی اکلوتی بیٹی زونا نشہ کے ساتھ کر دیں گے یوں ان کا خون ایک دفعہ پھر اس محل کی دیواروں میں حرارت بن کر دوڑے گا۔ خواب بھی اونچے تھے اور ارادے بھی۔ بس طرف بے حد چھوٹا تھا۔ وہ دل میں بے شمار فیصلے قائم کرتے ہوئے طلال حسن خان کے صندلی فریم والے پورٹٹ کو دیکھے گئے۔ انہیں لگا جیسے آج ایک طویل عرصے کے بعد طلال حسن خان کے بے تاثر چہرے پر مسکراہٹ سی رہی ہے۔



فوزیہ پھوپھو ناراض ہو کر واپس چلی گئی تھیں۔ بقیوں ان کے۔۔۔ ان کی شدید نوعیت کی بے عزتی کی کئی تھی۔ کیا تھا جو حرم کے لیے ہارون کا رشتہ قبول کر لیا جاتا۔ مگر بات جب جمل نکلیا کے کانوں میں پڑی تو انہوں نے دو ٹوک انداز میں منع کر دیا تھا بلکہ وہ فوزیہ پھوپھو پر باقاعدہ غصہ ہوئے تھے اور رد عمل کے طور پر اسی دن انہوں نے سامان باندھا۔ بچے اکٹھے کیے اور روٹی بسورتی نکل لیں۔ بے جی سے تولی بھی نہیں اور انہوں نے بھی پیٹھے پیٹھے ہاتھ جھٹک کر زوردار ”مہونہ“ بول دیا۔ فی الحال وہ خود بھی بکی چاہتی تھیں کہ فوزیہ پھوپھو اپنے گھر سردھاریں تاکہ وہ حرم کے لیے سکون اور تسلی سے کچھ طے کر سکیں۔ میاں جی نے البتہ بہتیری کو کشش کی تھی انہیں روکنے کی۔ پیار سے پکارتے۔۔۔

”چل بھوڑی۔ پتر نہ جا۔ جانے دے غصہ۔!“
”ہرگز نہیں میاں جی۔ نیو۔!“

مگر صرف نظر آنے کی حد تک۔۔۔ نواب زادہ طلال حسن خان۔۔۔ مرحوم! ”آپ کی جواں مری کا دل غ ہمارے سینے ہاں سورین کر دھرا ہے۔ ہم نے برسوں اس کی آبیاری کی ہے۔ اور تب تک کریں گے جب تک نواب حسین احمد خان کا سینہ ایسے کئی ہاں سوروں سے چھلنی نہ کر دیں۔ ہم ان کی نگاہوں کے سامنے سے اپنا ”کوہ نور“ جھپٹ لائیں گے اور پھر وہ اپنے بھاپے کے بقیادوں یوں ہی تڑپ تڑپ کر کائیں گے جیسے ہم نے گزشتہ کئی سال کائے ہیں۔ آپ کی قبر پر کھڑے ہو کر جو قسم ہم نے کھائی تھی طلال خان۔۔۔ آج اس کے پورے ہونے کا دن آن پہنچا ہے۔ ہم اس محل کا وارث۔۔۔ اپنا خون اور آپ کے اکلوتے بیٹے ”چھوٹے نواب“ کو لینے عتق پر پاکستان جا رہے ہیں۔“

نواب زادہ طلال حسن خان کی تصویر کے آگے کھڑے ہو کر اندھا دھند زہرا نکلتے ہوئے انہیں لمحہ بھر کو یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ان کے دیے دکھوں کے تمنے تو آج بھی نواب حسین احمد خان کے سینے پر سجے ہیں جو بے کسی اور دیردہری کی موت نواب زاوی عاشرہ خان کا مقدر بنی تھی وہ بھی بھی فراموش نہیں کر سکے تھے۔ آج بھی وہ تنہائی میں بیٹی کو یاد کر کے بچوں کی طرح ہلکے اٹھتے تھے جس کا مرامنہ بھی انہیں دیکھنا نصیب نہ ہو سکا تھا۔ طلال حسن خان نے تو دورے کی حالت میں خود کو دوسری منزل کی بالکونی سے گر لیا تھا۔ شدید زخمی ہونے کے بعد وہ جاہل نہ ہو سکے اور دم توڑ گئے۔ جبکہ نواب زاوی عاشرہ کو تو دھکا دے کر گر لایا گیا تھا۔ کسی کو خبر بھی نہ ہو سکی۔ اور وہ مدتوں سے دیار غیر میں نواب خاندان کے خاندانی قبرستان میں پھونڈ خاک تھیں۔ نواب تہرک حسین خان کی بیگم کا بھی برسوں ہوئے ساتھ چھوٹ چکا تھا ایک بیٹی تھیں رومانہ۔ وہ طلال حسن خان سے چھوٹی تھیں۔ بیاہ کر دکن گئیں۔ وہیں پر اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوش و غرم زندگی بسر کر رہی تھیں۔ طلال حسن خان کے مرنے کے بعد سے تو وہ مزید خوش و غرم

”چل نا۔۔۔ چوکی بات نہیں مانے گی۔ نہ جا۔۔۔!“
 ”میں اب ہرگز نہیں اسے کروں گی میاں جی۔۔۔!“
 ”ماں جا پتر۔۔۔!“
 ”نہ۔۔۔ میاں جی۔۔۔!“
 ”ماں جا۔۔۔!“
 ”ناں۔۔۔!“

”چل فیرجھمتی نکل۔۔۔ ترین چھوٹے والی ہے تیری۔۔۔!“

میاں جی نے ناک کھجاتے ہوئے بے نیازی سے کہا اور فوزیہ پھوپھو منہ بسور کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔۔۔ میاں جی نے عمیس کو آواز دی اور اسے فوزیہ پھوپھو کو جلدی سے اسٹیشن چھوڑ کر آنے کے لیے کہا۔ عمیس اندر سے یکدم برآمدے میں یوں نمودار ہوا جیسے کسی نے دھکا دے کر پھینکا ہو۔۔۔ کینڈی کے اداس چہرے پر رونق سی اتر آئی۔ وہ تو ابھی داپس بھی نہیں جانا چاہتی تھی مگر اس کی دھگھوریوں پر چلی بیٹھ رہی۔ بے جی نے بغوریہ منظر دیکھا تھا جبکہ میاں جی کا دھیان عمیس پر تھا۔ وہ گردو پیش سے بیگانہ سا کینڈی کو یوں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے آخری دیدار کر رہا ہو۔ میاں جی کو اس کا چھچھور پن دیکھ کر اندر ہی اندر ہال آ رہا تھا مگر موقع کی نزاکت کا خیال تھا۔ وہ کسی کو متوجہ نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے پہلے تو پا کا سا بڑبڑاتے ہوئے اسے ”بے غیرت“ کہا اور پھر قدرے اونچی اور ٹھوس آواز میں مخاطب ہوئے۔

”میں کہتا عمیس پتر۔۔۔ ایک شاپر میں اپنی آنکھیں ڈال اور پھوپھی کے تالے بنی بھیج دے۔۔۔!“
 عمیس نے یکدم سٹپا کر میاں جی کو دیکھا جو قہر یار نگاہیں اسی پر جمائے ہوئے تھے۔ کینڈی کا چہرہ محنت سے سرخ ہوا تھا جبکہ بے جی نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے سر پیچ کر لیا تھا۔ وہ جو سوچ رہی تھیں یہاں وہی معاملہ تھا۔ انہوں نے اپنے اندازے کی درستی پر خود کو دودی۔ فوزیہ پھوپھو دونوں بھابھیوں سے رورو کر گئے مل رہی تھیں۔ بھائیوں سے بھی وہ ناراضی

کے اظہار کے طور پر بغیر ملے چلی گئی تھی۔ اسی وقت حرم کالج سے لوٹی تو اس سے بھی فوزیہ پھوپھو۔ گیٹ پر کھڑے کھڑے ہی مل گئیں۔ اور جلدی سے اپنی پلٹن لے کر عمیس کے ساتھ نکل گئیں۔ اس افرا فری پر حرم حیران پریشان ہی کھڑی تھی جبکہ گھر کے بقیہ افراد کے تاثرات خاصے اطمینان بخش تھے۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتی وہیں بے جی کے پیروں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ بے جی حرم سے نہ جانے کیا کھسر پھسر کیے جا رہی تھیں پر اس کا دھیان نہیں اور انکا تھا۔ یکدم کوئی خیال آنے پر وہ تیزی سے اٹھی۔ اتاری ہوئی سینڈل دوبارہ اڑائیں۔ اور بے جی کو ”بھی آئی“ کہہ کر گیٹ سے باہر نکل آئی۔ اس کا رخ کچھ فاصلے پر بنے پارک کی طرف تھا۔ آج احرار نے اسے ضروری بات کرنے کے لیے وہاں بلایا تھا اور وہ یکسر بھول گئی تھی۔ وہ تیز قدموں سے چلتی پارک میں داخل ہوئی تو حیران رہا تھا۔ کوئی اکا دکا بزرگ آدمی بیچوں پر بیٹھا دوپ سینک رہا تھا۔ حرم گیٹ کے قریب ہی ایک بیچ پر بیٹھ کر بے چینی سے احرار کا انتظار کرنے لگی۔ آج اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے مجبور کرے گی کہ وہ حسین نانا اور زینب نانی کو رشتہ لانے کے لیے کہے۔ ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔

اسے وہاں بیٹھے ہوئے ہیں منٹ گزر گئے مگر احرار کا کوئی پتا نہیں تھا۔ وہ زنج ہونے لگی تھی۔ جلدی میں اپنا سیل فون بھی بے جی کے پلنگ پر چھوڑ آئی تھی ورنہ کل کر کے ہی پوچھ لیتی۔ مزید دس منٹ انتظار کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور مضطرب ہی گیٹ کی طرف چل دی۔ نظریں مسلسل ادھر ادھر ہینک رہی تھیں کہ شاید کسی سے احرار کا چہرہ نظر آجائے۔ جی ہی جی میں غصے کو دباتی وہ پارک کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی جب کسی نے دور سے اسے پکارا تھا۔ وہ تھک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ایک خوش پوش اور خوش شکل سانو جوان تیز قدموں سے چلا اس کی سمت آ رہا تھا۔ حرم نے اسے پہچاننے کی کوشش کی

”اوہ ڈاکٹر بلال!۔۔۔“
 ”کیسی ہیں آپ؟ پہچانا مجھے؟“ قریب پہنچ کر ڈاکٹر بلال نے خوش سے پوچھا۔
 ”جی۔۔۔ پہچانا نہ ہوتا تو کبھی ٹھہرتی نہ!“

حرم نے سادہ لہجے میں جواب دیا۔۔۔ ڈاکٹر بلال فوراً سنبھلا تھا اور خود کو کمپوز کرتے ہوئے بے جی اور کونٹکو کا حال احوال دریافت کرنے لگا۔ چند منٹ حرم نے بے حد تھل سے سوالوں کے جواب دیے تھے مگر پھر اسے کوفت نے گھیر لیا۔۔۔ ایک تو پہلے ہی اصرار پر غصہ تھا اور سے یہ ڈاکٹر بھی لسوڑھ ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے جان چھڑانے کی غرض سے کہا۔

”ایسا ہے ڈاکٹر بلال!۔۔۔ میں کسی دن اپنے بھائی کو آپ کے کلینک بھجوا دوں گی۔ آپ اس کا تفصیلی معائنہ کر لیجئے گا۔ آپ کو وہ بارہ مجھے سہرا روک کر اس کا حال دریافت کرنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی۔ چلتی ہوں!“

حرم نے قدم آگے بڑھادیے۔۔۔ ڈاکٹر بلال خفیف سا کھڑا سے جاتا دکھتا رہا۔ یہاں تک کہ بالکل سیدھی سڑک پر کٹنی فاصلے پر حرم ایک خوب صورت کوشی میں ٹھہرتی دکھائی دی۔

”اوہ۔۔۔!“ ایک خوشگوار اور طمانیت سے بھرپور سانس ڈاکٹر بلال کے منہ سے خارج ہوئی۔ تو آخر اسے اس دل کشین پری بیکر کا اتنا تامل ہی کیا تھا جس کے لیے وہ گزشتہ کئی دن سے کالونی کی گلیوں میں خوار ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر بلال نے تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

”میاں! آج کل ہم خاصے پریشان ہیں۔ نہ جانے کیسے اندیشوں سے دم بھتا رہتا ہے۔“
 تنگی بسلط پر مہارت سے ایک مہو آگے بڑھاتے ہوئے نواب حسنین احمد خان نے کہا۔۔۔ لہجہ قدرے بوجھل اور بجا بجا سا تھا۔
 ”دانش مندی کا تقاضا ہے کہ جب سستانے

بیٹھیں تب بھی چوکے رہیں تاکہ دشمن آپ کی فرصت کو کمزوری نہ جانے اور پیٹھ پیچھے وار نہ کرنے پائے۔ امید ہے کہ میری بات آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔!“ نواب صاحب کے اعصاب کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اس پنج پرتوانہوں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ وہ یکدم گم صمم سے ہو گئے اور چند ثانیے بعد جب گویا ہوئے تو آواز بھلے ہی دھبی دھبی مگر لہجہ مضبوط تھا۔
 ”آج پانچواں دن ہے میاں۔ ہمارا نواسہ ہم سے کتنی کترا رہا ہے۔ اصرار میاں ہمارے پیدا رہنے سے پہلے نکل جاتے ہیں اور رات آنکھ کھلنے کے بعد تشریف لاتے ہیں۔ ہم پر نظر پڑے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ جالچ رہے ہوں۔ کسی کھونج میں ہوں۔!“

”تو پتا کیجئے ناں۔ نواب صاحب! عمر ہے۔ تجربہ ہے۔۔۔ چوٹ کھائے بیٹھے ہیں۔ آپ بھی چاہیے کہ کس زخم کا کھر بڑا کھڑا چاہتا ہے۔۔۔ رنے سے پہلے مرہم کا انتظام کیجئے۔۔۔ عمر سے کچھ نہیں ہوتا نواب صاحب۔۔۔ کھلاڑی مہارت رکھتا ہو تو باری بازی پلٹ سکتا ہے۔۔۔ جیسے یہ رہا آپ کا مہو۔“ انہوں نے نواب صاحب کا ہاتھ تھام کر ایک مہرے پر رکھا۔
 ”اور یہ رہی آپ کی چال۔۔۔“ دھیرے سے ان کے ٹھنڈے ہاتھ کو جنبش دی ”اور یہ شہادت!“

نواب حسنین احمد خان کے کمزور سے پیادے نے ان کا بادشاہ مار دیا تھا اور وہ بڑے ٹھنڈے بیٹھے انداز میں نواب صاحب کو تنک رہے تھے جبکہ نواب حسنین احمد خان یک تنک بسلط کو حیرت سے تنکے جا رہے تھے۔ یہ جیت ان کی توقع کے برعکس تھی۔

نواب صاحب نے دھیرے سے ہلکیں اٹھائیں ہلکی گھائی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ انہوں نے اپنے مقابل بیٹھے اس مہولان چہرے کے لیے دل میں بے پناہ محبت محسوس کی۔ جی ہی جی میں مرہم ارادہ باندھا کہ اب کی بار انہیں کسی صورت شکست نہیں کھانی۔ نہ اختیار سے اور نہ وقت سے!

زیادہ تکلیف اس بات کی تھی کہ اس دن پارک میں نہ آنے کے باوجود اس نے معذرت کا یا شرمندگی کا کوئی فون تک نہ کیا تھا۔ اور اب حرم کا غصہ حقیقی تھا۔ پریشانی میں بدل چکا تھا۔ ایک دفعہ بھانے سے اس کے گھر بھی ہو آئی تھی مگر نہ بٹائی بھی اس کی روئین سے ہزار بیٹھی تھیں۔

اور اب یہ ڈاکٹر بلال کا رشتہ کیا وہ اتنا بے خبر تھا یا پھر جان چھڑانے کے بھانے ہیں؟ حرم نے دیکھتے سر کو دائیں بائیں کی انگلیوں سے مسکتے ہوئے سوچا۔ اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ بیٹھک میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ اس کی ساری دلچسپی کا سلمان تو دیوار پار تھا اور دیوار پار بیٹھا سا جن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سمندر پار جا بیٹھا ہے۔ بیٹھک سے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں باہر تک سنائی دے رہی تھیں۔ اندر میاں جی کے بھڑکنے اور بھڑک کے صلواتیں سننے کی آواز اب صاف اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔

”میں کہہ دتا۔ کوئی سوچے وی نا۔ اے میں ہونے ہی نہیں دیتا۔ پادیں (چاہے) وہ نواب کا پتر میرے پیروں میں آکر بیٹھ جائے۔“

”تے فیر میں وی آکھ دتا۔ کہ حرم داویاہ میں احرار نال ہی کرنا۔ پادیں ج دی ہو جائے۔ میں زبان دتی اے۔“ بے جی نے بھی گرون اکڑا کر تڑی دی۔ میاں جی نے طنز سے ہنسا کر ابھر کر کہا۔

”ہونہ۔ اکھتری زبان۔ زبان تے تیرے منہ دھج اے۔ مینوں پاگل بنائی اس۔“

”کل سنو جمل دے ابا۔ دشمنی تے صرف حسین بھرا نال اے نا۔ احرار نالنے نے کی قصور کہتا اے۔ اپنا سوہنا منڈا۔ اپنا لیتی فتن (الائق فائق)۔ تسمی بن جان دیو پر اپناں گلاں۔ دل دوا کر لو توے سارے گلے آپوں آپ ہی تک جانے۔“

بے جی اب کے بے حد رسلان سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ میاں جی نے آنکھیں چند ہی کر کے بے جی کو بغور دیکھا اور پھر تپا جمل اور اجمل صاحب پر نظر ڈالی۔ قریب پڑا سلکتا حقہ ٹھینا اور ایک بھر پور

حرم کا رشتہ آیا تھا۔ ڈاکٹر بلال کے لیے اس کے والدین سوالی بن کر آئے تھے۔ اور بہت محبت سے تقاضا کیا تھا۔ پوری کوٹھی میں تھر تھکی سی بچہ جی تھی جیسے۔ رشتہ بہت پائے کا بھی تھا اور پوری فیملی خاصی اسٹینڈرڈ کی تھی۔ پڑھی لکھی۔ شائستہ اطوار اور وضع وار۔

بے جی کا میٹر تو اسی لمحے گھوم گیا تھا جس لمحے انہوں نے ڈاکٹر بلال کو ڈرائنگ روم کے سنگل صوفہ سیٹ پر وائٹ کوسے بیٹھے دیکھا تھا۔ میاں جی البتہ بے حد خوش تھے اور نیچے جا رہے تھے۔ کیونکہ ڈاکٹر بلال کے دادا کا تعلق بھی میاں جی کے پنڈ سے نکل آیا تھا اور میاں جی اس بات پر ”خاخواہ“ والا آخر محسوس کر رہے تھے۔ بے جی نے جھٹک دیاں بیٹھے رہنے کی ذمہ داری پوری کی تھی مگر نہ ان کا دل کر رہا تھا کہ بغیر گلی لپٹی رکھے صاف کہہ دیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ مہمانوں سے بھی وہ اکھڑی اکھڑی سی رہیں۔ جبکہ بیگم اجمل اور بیگم جمل بھی مرعوب سی خاطر داری میں لگی تھیں۔

مہمان چلے گئے اور رشتہ ڈال گئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ اسٹینڈرڈ نہیں کی جائے گی۔ اور اب ڈرائنگ روم میں میاں جی۔ گھر کے بچوں کے ساتھ مل کر ریفرنشمنٹ کے لیے رکھی گئی چیزوں کا صفایا کر رہے تھے۔

بے جی نے فون کر کے فوراً ”تپا جمل اور اجمل صاحب کو بلایا تھا۔ دونوں سرعت سے پہنچے تھے اور پھر کچھ ہی دیر میں گھر کے سارے بچے بیٹھک میں بند ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ اور لیں بھائی بھی گھر آتے ہی بیٹھک کی نذر ہو گئے تھے۔ عمیس نے بہتری کوشش کی کہ اسے بھی بیٹوں کی صف میں شامل سمجھا جائے مگر میاں جی کی ایک کھلی نظریں اس کی ہوا نکال دی تھی۔ اب وہ شرافت سے بیٹھک کی اس کھڑکی سے کان لگائے کھڑا تھا جو لان کی طرف کھلتی تھی۔ جبکہ حرم کمرے میں بند تھی۔ احرار کو کال ملا ملا کر انگلیاں گھسی گھسی مگر اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔

کس لینے کے بعد بلغمی آواز میں بولے۔
 ”جائے کیا یاد کرے گی۔۔۔!“ حاضرین کے چہرے
 یوں کھلے جیسے بجھتے دے میں تیل ڈال دیا ہو۔ سب
 ہی نے ایک برسکون سانس خارج کی تھی۔
 ”جائے نہیں مکانا (ختم کرتا) میں گلے اکر لے جو
 بھی کرنا۔ آپ کی بار میری لت (ٹانگ) اوپر ہی رہے
 گی۔۔۔ میں نے بھی اپنے آپ کو زبان دی ہے۔۔۔ یہ
 دیکھ۔“ میاں جی نے اپنے زبان باہر نکال کر بے جی کو
 دکھائی۔ ”میرے منہ سے دھج ہی ہے یہ!“ بچوں کی
 طرح ایک بار پھر سب کو اپنی زبان کا دیدار کر کے حلقے کا
 کش لیا اور دھواں بے جی کے چہرے کی طرف رخ کر
 کے چھوڑ دیا۔ جن کے تیور خاصے جارحانہ ہو رہے
 تھے۔ جمال تب بھی یکدم پریشان سے ہوا اٹھے۔
 دھیمے اور باادب لہجے میں گویا ہوئے۔
 ”میاں جی۔۔۔ آپ کا فیصلہ سر آنکھوں پر۔۔۔ مگر
 اب سے پہلے ماضی میں بیٹوں کی۔۔۔ کی گئی غلطیوں کا
 خمیازہ ہم سب نے بھگنا اور ابھی تک بھگت رہے ہیں۔
 کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک اور غلط فیصلہ کر کے ہم
 اپنی اگلی نسل کو اس کا خراج بھرنے کے لیے چھوڑ
 جائیں۔۔۔ تاکہ یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہ سکے۔۔۔ بے
 دریغ غلط فیصلے صادر ہوتے جائیں اور ہماری نسلیں
 ان کی بھینٹ چڑھتی جائیں۔ کیا ایسا چاہتے ہیں آپ؟“

”پتھر۔۔۔! تو کرتا ہے کتلی باتیں اور میں حقیقت کے
 پنے اٹھتا ہوں۔“ میاں جی کا مدبرانہ جواب آیا۔
 پھر ایک خشمگین نظر اجمل صاحب پر ڈال کر
 بولے۔
 ”یہ اپنا صدر ممنون ہے جو۔۔۔ اس سے بھی پوچھ
 لے۔۔۔ ہو رہے یہ ہی وہ نہ چاہتا ہو مٹانا جو تم لوگ
 چاہتے ہو۔۔۔!“

”صدر ممنون“ میاں جی اجمل صاحب کو کہا
 کرتے تھے۔۔۔ ان کی خاموشی جو انہیں ہمیشہ ان کی
 فرماں برداری لگا کرتی تھی۔ اس وقت زہر لگ رہی تھی۔
 انہیں یقین تھا کہ ان کا یہ سپوت ان کی مرضی کے

خلاف جانی نہیں سکتا۔
 ”میں نے کیا کہنا ہے میاں جی! جو بے جی اور بونے
 بھائی صاحب فیصلہ کریں۔۔۔ مجھے منظور ہو گا۔۔۔ حرم ان
 ہی کی اولاد ہے۔۔۔!“ اجمل صاحب نے ہمیشہ کی طرح
 جھکے سر کے ساتھ سیدھا سا جواب دیا۔
 ”نا۔۔۔ تو کاغذی بابا ہے حرم کا۔۔۔ وڈا تو بے لڑا۔۔۔ اگے
 پیچھے بولتا نہیں۔۔۔ بولا تو لکھن ہی پھاڑا۔۔۔!“
 میاں جی کے بس میں نہیں تھا کہ اجمل صاحب کی پھینٹی
 لگا دیتے۔ بے جی کے چہرے کی چمک لوٹ آئی۔
 واری صدقے جاتے ہوئے بولیں۔
 ”چھڑو جی۔۔۔ جمال دے بابا۔۔۔! میراے پتر بڑا ہی
 مہالے۔۔۔ پہلاں تولد اے فیرو ولد اے۔۔۔!“
 ”پر میں نہیں مانتا۔۔۔ ایسے رشتے میں بڑے رولے
 ہیں۔۔۔!“ میاں جی کی سوئی وہیں انکی تھی۔
 ”رولے تو اڈے (آپلے) دماغ دھج نے۔۔۔!“ بے
 جی نے تیوریاں چڑھائیں۔
 ”مان جائیں میاں جی۔۔۔ بچوں کی خوشی دیکھیں۔“
 جمال نکلیا کا التجائیہ انداز۔
 ”تسمی صرف میری مرضی دیکھو۔۔۔!“ میاں جی کی
 وہی اکڑ۔
 ”مان جائیں میاں جی۔۔۔ میری بیٹی وہاں خوش رہے
 گی۔۔۔!“ اجمل صاحب نے منمناتے ہوئے عرض کیا۔

”نا۔۔۔ کتنا نا۔۔۔!“ وہی صفا حثنا بے جی کا پارا
 چڑھائے رہی تھی۔ کب سے مکمل خاموشی گئے
 ساتھ ساری کارروائی بلا حلقہ کرنا اور بس اب کے چپ
 نہ رہ سکا۔۔۔ جھوک نکل کر۔۔۔ گردن کو ہلکا سا جھکا دیتے
 ہوئے بولا۔
 ”پتھر! جی دھٹ احرار کی طرف ہی ہے میاں جی!
 وہ بہترین لڑکا ہے۔۔۔ ہم اس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے
 ہیں لہذا اس کو ہم سے بہتر کون جانے گا۔۔۔ میرا خیال
 ہے کہ آپ۔۔۔!“
 ”او۔۔۔ تو چپ کر او کا کا۔۔۔!“ میاں جی نے غصے سے
 بانہ لہرا کر اور بس کو چپ کر لیا۔۔۔ چہرے پر افسردگی

لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولے۔
”قسمی سارے ملے ہوئے اور ایسے طراح کرو کہ
اپنے نوڈے دیج بند کرتے دریا دیج روٹھ دیو۔“
(ہمالہ)۔

”نا۔ ناخبری صلا۔“ بے جی نے مٹھی بھیج کر
پینے پر رکھی۔ میاں جی خوش ہوئے کہ تیرنشانے پر
لگا۔

”کیسی آں گلاں کروے اور جمل دے ابا۔ دریا دیج
ایویں ای روٹھ دیں۔ ڈبے میوں دے دیا جے۔ میں
ساجھ (سنبھال) لوں کی۔“ بے جی نے ناک پر سے
مکھی اڑاتے ہوئے گویا قصہ ہی ختم کیا۔ اور میں اور
اجمل صاحب نے ہنسی چھپانے کے لیے اوھر اوھر
دیکھنا شروع کر دیا۔ جمال بابا نے سر پکڑ لیا کیوں کہ
بے جی نے معاملہ بگاڑ دیا تھا۔ کھڑکی سے لگا عمیس
اور وری بلین لیے اندر کو بھاگا۔

میاں جی کے تھنے پھرنے لگے تھے۔ مارے طیش
کے سینہ اٹنے لگا۔ خرخراتی سانس جاری ہو گئی۔
بے جی نے جی ہی جی میں خود کو ساسا۔ ناحق طیش دلا دیا
۔ اور دو چار جنابی جملے ہوتے تو میاں جی ڈھسے ہی
جاتے مگر اب تیرنشان سے نکل گیا تھا میاں جی اپنی
جگہ سے کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھ پیچھے باندھتے
ہوئے پھر پور سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

”حرم کا ویاہ ڈاکٹر بلال نال ہی ہوئے گا۔ یہ میرا
آخری فیصلہ ہے۔ بن کسی نے احرار داناں میرے
سامنے لٹھاتے میرا مویا (مرا) منہ دیکھے گا۔“

بیٹھک میں یک دم خاموشی چھا گئی۔ سب اپنی
جگہ جے بیٹھے رہ گئے۔ میاں جی کرم چادر کی بٹل
مارتے۔ حقہ ہاتھ میں اٹھائے تن کر جلتے باہر نکل گئے
تھے۔ بے جی نے اپنے ہاتھوں سے ایسی گرہ لگائی تھی
جسے منہ سے کھولنے کے لیے دانت کدھر سے لائیں
۔ اب تو بس انہونی ہو جانے کی دعا کرنی تھی۔!

سارا دن برستی بارش نے سردی کی شدت میں

اضافہ کر دیا تھا اور رات ہونے تک ہلکی ہلکی پھوار پھر
سے شروع ہو گئی تھی۔ اس ٹھنڈی سردی سے بے
نیاز احرار کب سے چھت پر ٹپلے جا رہا تھا۔ اس کے
وجود کے اندر نہ جانے کون سا لالہ بھڑک رہا تھا جو اسے
چپین ہی لینے نہیں دے رہا تھا۔ سرخ ہوئی ناک اور
متورم آنکھیں لیے اس کا لمبا چوڑا خود بھی اس کے
خیالات کی طرح منتشر تھا۔ بیزاری اس کے روم روم
سے چھلکتی تھی۔

اجانک دیوار پار چھت پر کھڑکا سا ہوا۔ کوئی سچ
سچ چٹنا اسی کے پاس آ رہا تھا۔ وہ دونوں چھتوں سے
متصل دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا مگر پلٹ کر
نہیں دیکھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ حرم کے علاوہ کوئی اور
نہیں ہو سکتا۔!

حرم کے دل میں جیسے کوئی کانٹا سا چبھا تھا۔ اتنے
دن ہو گئے تھے انہیں ایک دوسرے کو دیکھے۔ اور اب
جب اتفاقاً ”وہ اسے مل ہی گیا تھا تو اتنا بے نیاز کیوں
دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ وہ کتنے ہی
شکوے کرے گی۔ خڑے دکھائے گی۔ ناراضی کا
اظہار کرے گی اور تب تک نہیں مانے گی جب تک
اسے اتنا ہی ستانہ لے جتنا وہ خود پچھلے کئی دنوں سے
پریشان تھی۔ مگر یہاں احرار تو وہ احرار لگ ہی نہیں رہا
تھا۔ اس کا بے حد سنجیدہ اور سپاٹ چہرہ دیکھ کر حرم کو
یوں محسوس ہوا جیسے پہلی بار وہ ”قنواب زادہ احرار حسن
خان“ سے متعارف ہو رہی ہے۔ وہی نوبلی رعونت اور
ظننہ اس وقت اس کی خوب صورت کھڑی ناک پر
بڑی شان سے براجمان تھا۔

حرم بے اختیار جبکہ کر چند قدم کے فاصلے پر ہنٹ
کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس ٹھنڈی سردی
میں وہ بغیر کسی جیکٹ یا گرم سوئیٹر کے کھڑا تھا۔ اس
کے چوڑے اور مضبوط شانے بارش کی پھوار نے بھگو
ڈالے تھے۔ اس نے بے شکل بات شروع کرنے کے
لیے سرا نکالا۔

”احرار۔! تمہیں اتنی سردی میں یوں کھڑا
نہیں ہونا چاہیے۔ اگر بیمار پڑ گئے تو۔! دیکھو نا تم

سارے بھیگ چکے ہوں!“
 حرم کو اپنا ہی بدلہ لے رہا اور پر تکلف محسوس ہوا۔
 وہ اپنے ہونٹ چبانے لگی۔
 ”تم اوپر کس کام سے آئی ہو؟ کوئی تماشا کھڑا کرنا
 ہے کیا؟“ اس غضب کی ٹھنڈ نے حرم کے اعصاب
 شل نہیں کئے تھے مگر احرار کے بے مہربانے اور اجنبی
 جملے نے اس کی رگوں میں دوڑنا ہو ضرور جمادیا تھا۔
 ایک ہی بل میں اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر
 گئی تھیں۔ وہ بمشکل ضبط کرتے ہوئے بولی۔ اس
 کے انداز میں کھیلا پن تھا۔

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے نواب زادہ
 احرار حسن خان۔ کہ میاں جی نے میرا رشتہ طے کر دیا
 ہے۔ میں جو آپ کی تھمائی آس کی ڈوری تھا۔ اتنی
 آگے نکل آئی تو کیا اس لیے کہ آپ وقت بڑے پر پیٹھ
 موڑ کر کھڑے ہو جائیں۔ یا میری محبت کو سستا جان
 کر تماشا بنا میں!“
 ”تو پلٹ جاؤ واپس، واپسی کا راستہ ابھی کھلا اور
 ہموار ہے۔ میں آج سے۔ ابھی سے وہ ڈوری کاٹنا
 ہوں جسے انجانے میں نہیں تھما بیٹھا۔“
 رنجے اڑنا کیا ہوتا ہے۔ یہ آج حرم نے جانا تھا۔
 اس قدر لہنت۔ اتنی ناقدری۔ اتنی دور آکر کیا وہ
 واپس پلٹ سکتی تھی؟ کیا وہ کسی اور کی ہو سکتی تھی؟
 وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے یک رنگ احرار کے گھنے
 براؤن بالوں والے سر کی پشت کو نگے جا رہی تھی اور
 آنسو قطار در قطار کٹوروں سے تھلکتے چلے گئے۔ اس
 کے پاس سارے لفظ ختم ہو گئے تھے جیسے۔ اور وہ
 اسے کہتی بھی کیا۔؟ منت ساجت کرتی۔؟ کیوں۔؟

تاکہ اس کا دل پھل جائے۔؟ اور اگر اس کے دل کو
 موم ہوتا ہی ہوتا تو کیا وہ اسے اتنی بڑی بات کہہ ڈالتا۔؟
 نہیں چرگز نہیں۔۔۔ وہ کسی صورت مزید خود کو نہیں
 گرائے گی۔ مزید اپنی عزت نفس کو روندنا اس کے
 اختیار میں نہیں تھا۔ وہ میکانیکی انداز میں دو قدم پیچھے
 ہٹی۔
 احرار نے اس کی مسلسل خاموشی پر ایک ذرا سارخ

موڑ کر اس کی موجودگی کو محسوس کیا۔ پلٹ کے اس
 سنگدل نے ابھی بھی نہ دیکھا تھا۔
 ”مجھے سمجھنے کی کوشش کرنا حرم۔! میں بہت
 الجھنوں میں گھرا ہوا ہوں، رشتوں کے بننے اور ٹوٹنے
 کے عمل کو سمجھا رہا ہوں۔۔۔ بلکہ میں خود ٹوٹ پھوٹ
 رہا ہوں۔۔۔ برکت دادا ابھی بھی اس رشتے کے لیے
 نہیں مائل ہیں گے۔ اور میں ان دونوں اس پوزیشن میں
 نہیں ہوں کہ کسی کو مناؤں یا مٹاؤں۔ میں تو خود
 ۔۔۔ میں تو خود۔۔۔!“

اس نے شدید بے چینی کے عالم میں دونوں ہاتھوں
 کی انگلیوں میں بالوں کو جکڑا۔ اور پھر بھجان زدہ سا چلا
 کر بولا۔

”میں تو خود اپنوں کی سفاکی کا شکار ہوا ہوں۔۔۔ میرا
 ہر رشتے سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔۔۔ میری قابلیت اور
 صلاحیت کو چیسے رنگ لگ گیا ہے۔۔۔ میں کسی کو کیا
 سناؤں گا؟ لیکن، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم
 سے محبت نہیں کرتا۔ بس میں مجبور۔۔۔“ وہ جھپٹے
 سے پلٹا تھا۔ اور پھر اسے جھٹکا لگا تھا۔ ساتھ والی
 چھت ویران بڑی تھی۔ حرم جا چکی تھی۔ اس کا دکھ
 جانے بغیر اس کا اعتراف سنے بغیر۔!!

اس نے بے حد آزر دگی کے ساتھ بالوں سے
 بھرے آہن کو ٹکا۔ بارش کا ایک قطرہ اس کے گل
 پر پڑا اور آنکھ سے بہہ جانے والے آنسو میں
 مدغم ہو گیا۔



جب وہ خود سے خمار لڑتے لڑتے تھک گیا تو نیچے
 آیا۔۔۔ وہ بے حد آزرہ تھا، یہ اس کے چہرے۔
 صاف ظاہر تھا اس کا بیڑہ دم لاؤں بچار کرنے کے بعد
 آتا تھا اور جس وقت اس نے لاؤں میں قدم رکھا
 وہیں ٹھک کر رک گیا تھا۔ نواب حسین احمد خان ابو
 زینب بی۔۔۔ دونوں ہی وہاں بیٹھے تھے۔ یقیناً ”اگر
 کے انتظار میں، وہ ایک گھبرا سانس بھرتا۔ سارا
 چہرے کے ساتھ ان کے قریب چلا آیا۔ ماحول:

او
 نہ
 ہی
 اند
 ہوا
 اند
 لرز
 تھی
 دایر
 ملنے

مکمل سکوت طاری تھا۔ براثر اور پروہشت!
 ”آئیے برخوردار۔ آئیے۔ آپ ہی کے لیے
 آج دو ضعیف و زار وجود اپنی توانائیاں جمع کیے بیٹھے
 ہیں۔ قسمت نے یہ دن بھی ہمیں دکھانا تھا کہ ہمیں
 اپنے نواسے سے ملے ہوئے کئی دن بیت چکے ہیں اور
 آج ہمیں مجبوراً رات کے اس پہرے ٹھنڈے
 چچی بوڑھی بیویوں کو نظر انداز کر کے۔ محض آپ
 سے اس سرد جنگ کی وجہ جانی ہے جو کئی دن سے آپ
 کے اور ہمارے بیچ جاری ہے۔“

ساگوان کی لکڑی سے بنی منقش چھتری یہ دونوں
 ہاتھ نکائے۔ بالکل سیدھ میں غیر مٹی لفظ کو نکلتے
 ہوئے نواب صاحب نے بے حد ہموار اور بے لک
 انداز میں گلہ کیا تھا۔
 احرار نے ایک تھکی تھکی بے تاثر نگاہ اپنے نانا جان
 پر ڈالی اور لب بھینچ کر سر جھکا لیا۔ نہ ننبی کی تھنی
 تھنی سسکیوں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اس
 کے دل کو کچھ ہوا ٹکراتے ہی بل کسی خیال نے اس کے
 نرم پڑتے احساسات پر برف ڈال دی تھی۔

”ہمیں جواب چاہیے برخوردار۔“ نواب
 صاحب اس کی جیب سے تنگ آکر دوبارہ گویا ہوئے۔
 ”آخر ایسا بھی کیا ہو گیا کہ آپ اتنے کٹھور ہو گئے
 کہ آج آپ کی مٹی جان کو بخار میں تپتے تیسرا دن ہے
 ورنہ آپ کو ان کا احوال دریافت کرنے کی بھی فرصت
 میں۔ کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ جسے ہم نے عصائے
 بری (برصائے کی لاشی) جان رکھا تھا۔ اسے
 دیہشوں کی دینک نے چاٹ لیا۔ نفرتوں کی سنگتی
 ٹی کا ایندھن بننا اس کا نصیب ٹھہرا۔“

نواب صاحب کی آنکھوں میں تیرتی نمی ان کے
 روئی خلفشار کی گواہ تھی۔ ان کا بدن ہولے ہولے
 زرد تھا۔ لاشی پہ ہاتھوں کی گرفت مزید سخت ہو گئی

احرار نے نگاہیں اٹھا کر بے حد رنجش اور تنفر سے
 ب صاحب کو دیکھا۔ جسم کی رگوں میں دوڑتا خون
 نلگا۔ بجان پہ طیش غالب آیا اور وہ پھٹ پڑا۔

”کیسی لاشی نانا جان؟ چرائی ہوئی؟ رات کی سیانی
 میں شب خون مارتے ہوئے کسی کی امیدوں اور
 تمنائوں کا مرکز آپ چرالائے۔ یہ سوچ کر کہ آنے
 والے کل میں وہ آپ کے بچھے چرائی کی لوہنے گا۔
 کیا کبھی جائز کو ناجائز کی کوکھ میں پختہ دیکھا آپ نے؟
 جو ایسی اس لگائے بیٹھے رہے۔“

لفظ نہیں تھے۔ گرم چچی سلاخی تھیں جو نواب
 حسین احمد خان کے جسم کے آپار ہو گئی تھیں۔ ان
 کا رواں رواں تکلیف کی شدت سے ہلکا اٹھا تھا۔ اتنی
 شدید نفرت۔ اتنا زہر۔ کس نے بھریا تھا ان کے
 نواسے کے اندر۔؟

ان کی پتلیاں ساکت تھیں اور زبان مفلوج۔
 نہ ننبی بیٹے پہ ہاتھ دھرے فوراً نواب صاحب کی
 طرف نکلیں اور ان کے کندھے سسلانے لگیں۔
 بے یقینی کی کیفیت میں وہ احرار کے چہرے کو سنے جا
 رہی تھیں جس پر شرمندگی کے برقی برابر بھی آچار
 واضح نہیں تھے۔ رگدھر خرابی ہوئی تھی؟ کس کا داؤ چلا
 تھا؟

ساری عمر برون میں چھپائے رکھا تھا اپنی بیٹی کی اس
 نشانی کو۔ گرم ہوا کا جھونکا بھی اسے چھو جائے۔ یہ
 ان دونوں میاں بیوی کو گوارا نہ تھا۔ نواب ایسا کیا ہوا
 تھا کہ لال آندھی ان کا آشیانہ پھونک ڈالنے کے
 درپے تھی۔

انہوں نے نواب صاحب کے سرد کانڈھوں کو گرم
 شال سے ڈھکتے ہوئے ایک نادبی نظر احرار پر ڈالی۔
 جو اب ”وہ نظر چڑھ گیا تھا۔“

”ان سے کیسے نہ ننبی۔ کہ ہمارے سلسلے سے
 ہٹ جائیں۔ جو آنسو ان کی دی ہوئی چوٹ پر ہماری
 آنکھوں سے چھلکنا چاہتے ہیں۔ وہ ہم ان کے سامنے
 بہا کر رازاں نہیں کرنا چاہتے۔ جائیں چلے جائیں
 یہاں سے۔“

نواب صاحب کی بھینچی بھینچی آواز میں انجانا کرب
 ہلکورے لے رہا تھا۔ نہ ننبی ان کے پیچھے کھڑی۔
 اپنے ہی کانڈھے پر لب رکھ کر سسکا اٹھیں۔ صرف

وہی تھیں جو اس وقت اپنے خاوند کی دلی کیفیت سے آگاہ تھیں۔

”چلا جاؤں گا۔۔۔ جلد چلا جاؤں گا یہاں سے۔۔۔ پھر آپ اپنے کیے پر آنسو بہانے کے لیے بالکل تنہا ہوں گے تانا جان۔۔۔ ویسے ہی جیسے آج تک میری جدائی میں، میرے دادا حضور نے بہائے ہیں۔!“ اصرار سفاکی سے اٹتا ہوا۔۔۔ تیز قدموں سے چلا لاؤنچ پارک کے اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔۔۔ اور پیچھے سکتے کی حالت میں زہ جانے والے دو بوڑھوں کے دل جیسے دھڑکننا بھول گئے تھے۔



میاں جی نے حرم کی شادی کی تاریخ طے کر دی تھی۔ گھر کی پہلی بیٹی کی شادی تھی۔ سوائے جی کے سب ہی راضی تھے۔ ہاں! عہد میں حرم اور اصرار کے لیے فکر مند تھا مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ ویسے بھی فوزیہ پھوپھو سب کچھ بھلائے ایک دفعہ پھر سلمان باندھے وارد ہوئی تھیں اور ساتھ میں بلاشبہ کینڈی بھی تھی جسے دیکھتے ہی عہدیں کامنڈ بیٹھا ہو گیا تھا۔ جمال تانے پر اسرار سی چپ سا دھ رکھی تھی۔ اور اجمل صاحب تو شروع سے ہی مرتجیل مریخ قسم کے انسان تھے۔ جدھر باب نے لگایا ادھر ہی سر تپایا۔ تو اب بھلا کیسے چوں چرا کر سکتے تھے؟ گھر کی خواتین پورے جوش و خروش کے ساتھ شاپنگ میں جت گئی تھیں۔ مشورے کے لیے بے جی کے پاس آئیں تو وہ سر تک لحاف تان لیتیں۔ بات چیت مکمل بند کر رکھی تھی انہوں نے۔ خاص طور پر میاں جی کو دیکھتے ہی لعل نماز کی نیت باندھ لیتی تھیں۔ میاں جی برا سا منہ بیاتے، سر جھٹک کر وہاں سے ہٹ جاتے مگر اپنی ضد سے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔

حرم نے کان سے استغنی دے دیا تھا۔ اور اب سارا سارا دن کمرے میں تھکی نہ جانے کیا کرتی رہتی تھی۔ اس کی متورم آنکھیں اور حلقے صرف بے جی کو دکھائی دیتے تھے۔ مگر وہ بے بس تھیں۔ صرف

انہوں نے کے لیے دعا گوارہ تھیں۔

میاں جی نے ارجنٹ ٹوئس پر زاریوں کو بلا لیا تھا۔ آخر کو حرم کا بڑا بھائی تھا۔ بہن کی شادی کے موقع پر اس کا ہونا بے حد لازم تھا۔ جس دن سے زاریوں آیا تھا، فوزیہ پھوپھو اس کے واری صدقے جاری تھیں۔ اس کے آگے پیچھے پھرتی وہ اسے بھی حیران کیے دے رہی تھیں۔ ماں الگ نظروں ہی نظروں میں بلا میں لیتی رہتیں۔ وہ خاصا نکھر گیا تھا۔ اسے پردیس کی آب و ہوا خاصی راس آئی تھی۔ گال سرخی مائل اور رنگت مزید سفید ہو رہی تھی۔ بول چال میں بھی واضح تبدیلی آئی تھی۔ اپنے چھ حریف جملے میں چار حرف انگریزی میں جھاڑنا وہ ہو فوزیہ پھوپھو کا ہی بھتیجا لگ رہا تھا۔ اور انگریزی بولتے ہوئے جس قدر اس کا منہ بگڑتا تھا اس سے ڈرنا۔ میاں جی کا اس کے انداز دیکھ کر بگڑ رہا تھا۔ وہ دن تو انہوں نے خالص حوصلے سے برداشت کیا اور تیسرے دن اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

جس دن زاریوں آیا تھا۔ اسی دن شام میں اس نے میاں جی کے فراموشی پیپ (سگار) ان کے ہاتھ میں تھمائے تھے۔ میاں جی بوئے خوش! اسی وقت سوچ لیا کہ جس وقت ان کا دشمن حسین خان اپنے گھٹ سے باہر آتا ہے۔ عین اسی وقت وہ گھر پہ منبھی ڈھا کے اس سوغات کے سونے لگائیں گے اور اسے چلائیں گے!

اگلے دن صبح گیارہ بجے کے آس پاس زاریوں بے جی کے بنگ کے قریب بیٹھا مالٹے کھا رہا تھا۔ وہ کٹ چھیل کے دھرتی جاری تھیں اور صاحب بہادر بڑی نزاکت و نفاست کے ساتھ چھانک چھانکے چھانکتے جا رہے تھے۔ میاں جی ہاتھ میں سگار کا ڈبہ پکڑے اندر سے برآمد ہوئے اور ذرا فاصلے پر بڑی کر سی پر بیٹھ گئے۔

دو ذریعہ نگاہوں سے بے جی کو دیکھا تو وہ مگن سی پوتے کے لیے مالٹے چھیل رہی تھیں اور ہلکی سی آواز میں بات بھی کر رہی تھیں۔ میاں جی کو مکمل نظر انداز کیے، میاں جی کو کھدہ سی لگ گئی مگر پوچھتے اتنا

آڑے آتی۔ پوتے یہ ناقدانہ نگاہ ڈالی تو تیر بدل گئے۔
 زارون کی جینز گھٹنوں سے پھٹی ہوئی تھیں۔ میاں
 جی نے ارد گرد دیکھا کہ کوئی گھر کی پچی تو نہیں ہے وہاں،
 جی ہی میں زارون کو بے حیا اور بے شرم کہا۔ ہاتھ
 میں تھامے ڈبے کی تاثیر تھی ورنہ انہیں ہانگ دیا
 کہنے سے بھی روک کون سکتا تھا۔ قدرے نرم لہجے
 میں پوتے سے مخاطب ہوئے۔
 ”زارون پتہ۔۔۔!“
 ”جی۔۔۔ جی گرینڈپا۔۔۔!“
 ”نگریز دا پتہ۔۔۔ پتہ۔۔۔ ایک دفعہ پھر دل میں اسے

اور جیسے ہی زارون کا ہاتھ حقے پر پڑا۔ عین اسی
 وقت بھینس کے گوبر پے پاؤں بھی جا پڑا۔ سارا دھیان
 تو حقے اور بھینس کی دم پر تھا۔ کسی اور طرف نظری
 نہیں گئی تھی۔

”او۔۔۔ مین! واٹ دا ہیل۔۔۔!“ اس نے کراہت
 سے آنکھیں میچ کر سرواٹھا لیا۔

”پتہ۔۔۔ یہ وہی ہیل ہے جسے تو ہی چکا (اٹھانا) کرتا
 تھا۔ بوہتی میں میں جیتی نا۔۔۔ تو اس ہیل میں تیرا سر
 دے دوں گا۔ سمجھا۔۔۔!“ میاں جی نے دو منٹ میں
 ساری فون فال نکال کر رکھ دی تھی۔ انہوں نے بھلا
 کمال اتنے نخرے برداشت کئے تھے۔

”اب میں کیا کروں۔۔۔ گرینڈپا۔۔۔؟“ زارون
 کر لایا۔

”میاں جی بول۔۔۔ میاں جی۔۔۔!“

”اب کیا کروں میاں جی۔۔۔! بے جی۔۔۔ ی۔۔۔!“
 زارون نے روہا سا ہوتے ہوئے لگے ہاتھوں بے جی کو
 بھی آواز دے ڈالی۔ مگر انہوں نے شاید کانوں میں
 تیل ڈال رکھا تھا۔ مجال ہے جو ذرا بھی ہمدردی سے
 پوتے کو دیکھا ہو۔ شاید انہیں بھی زارون کے
 اوپرے انداز و اطوار نہیں بھارتے تھے۔

”کرنا کیا ہے تو نے۔۔۔ ششدر ہے۔۔۔ وہی کر جو سلطان
 کیا کرتا تھا ہاتھ ڈال میہ پتر اور چار تھاپاں بنا کر دیوار پر
 لگا دے۔ میرے حق کی چلم کے لیے۔۔۔!“

میاں جی ایسی غضب کی لاپرواہی سے بولے کہ
 زارون کا دم خشک ہو گیا۔ اب بھلا دو سال انگلیٹڈ رہ
 آنے کے بعد وہ یہ کام کیسے کر سکتا تھا۔ وہ جی میں رو
 دینے کو تھا۔ میاں جی نے اس کے لیے تھوڑی کو
 بہت جان کے اس کی گلوفا صی کرائی۔

خطابات سے نوازا۔۔۔ جس دن سے آیا تھا اسی منحوس
 لفظ سے انہیں بکا رہا تھا۔ اور وہ اس ڈبے کی موت
 میں کڑوی گولی نگلے جا رہے تھے۔

”پتہ۔۔۔! معجب تو میرے لیے گیا تھا تو کیا تجھے کتے
 پر گئے تھے؟“ زارون نے بوھلا کے یوں ٹانگیں نیمیں
 جیسے وہاں کہیں آس پاس کتے ہی ہوں۔

”نو۔۔۔ ناٹ ایٹ آل گرینڈپا۔۔۔! آپ نے ایسا
 کیوں کہا۔۔۔؟“
 ”تیرے سمجھے کوڑے ویکہ کے۔۔۔!“

”اوہ۔۔۔! یہ فیشن آج کل ان ہے گرینڈپا۔۔۔!“ اس
 نے تسلی سے جواب دیا اور اپنے سمجھے کوڑے پہ سبھلی کی۔
 میاں جی نے بظاہر بے نیازی بیٹھی بے جی کے
 چہرے پہ ہیلیا دل جلانے والی مسکراہٹ کو کینہ توڑی
 سے مہور اور پھر انہوں نے ناک چڑھا کے، تنہے پھلا
 کے ہو، ہو اس انداز میں پوتے کو ناڑا جس طرح نگر
 مارنے سے پہلے تیل شکار کو تاؤ تہے۔

”اٹھ اوئے۔۔۔ اٹھ اوئے ذرا ادھر سے انگریزی
 گنڈے (ہیانک)۔۔۔!“ میاں جی اونچی ٹولٹولٹ بولنے کے
 زارون سے بولے۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ پہ کھڑا
 ہوا تھا۔

”وہ ذرا اپنی جگہ کے پڑے جا اور میرا حقہ پھر کے لا۔۔۔
 ہیں پڑا ہے۔۔۔!“ میاں جی حکما ”بولے۔۔۔ زارون کو
 بے حد کوفت ہوئی۔ بھلا بھینس کا کیا بھروسہ۔ اس
 کے اتنا قریب تو پڑا ہے حقہ۔۔۔ لے کے دم باردی تو۔۔۔

اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ خود بے حد اکتایا ہوا تھا فوزیہ پھوپھو کی ہر وقت کی اوپری محبتوں سے۔ ایسے میں عمیس کا اجڑا حلیہ اور کمرے میں گونجتے روتے بسورتے گانے نے اس کی طبیعت مزید مگر کر دی تھی۔ وہ اس کی ٹانگ پر زوردار دھبہ مارنا خود بھی دھب سے ہیڈ پر کر گیا۔ عمیس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔ اپنے سامنے زارون کو دیکھ کر بے رخی سے منہ پھیر لیا۔ ”رقیب روسیہ کی بی بی میں اسے وہی گھسا پٹا لقب عثایت کیا۔

”کیا ہے بے۔ ایسے کیوں گھور رہا ہے مجھے۔ اب تو میں اپنی جون میں بھی لوٹ آیا ہوں۔“ زارون کو کل میاں جی کے ہاتھوں نئی درگت یاد آ گئی۔ حلق پھوڑا یادداشت تک کڑی ہو گئی۔

”ہونہ۔! میری پیٹھ میں چھرا گھونپ کے چاہتا ہے کہ میں تجھے گھوروں بھی نا۔ واہ رے زانے۔! سارے جہاں کا زرد اپنے ڈانڈلاگ میں اندیل کر عمیس نے ناکام عاشق ہونے کا ثبوت دیا۔

”اے اے اے۔! وہ داس کے ملبی! سیدھی طرح بک کہ کس بات کا ماتم مٹا رہا ہے۔! زارون نے کس کے ایک مکا اس کے سینے پہ مارا اور اس کے چوہ طبق روشن فرمائے۔

”تمہیں کیا عالم غاصب۔ تم جاؤ اور اپنی ہونے والی بھابی کے ساتھ گلوچھوڑے اڑاؤ۔! عمیس نے کلائی آنکھوں پر دھر کر کراؤں کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے آزدی سے کہا۔ زارون نے ہونقوں کی طرح اس کو دیکھا۔ آنکھیں ہٹھانیں اور رولا۔

”ہائیں۔! کون سی ہونے والی بھابی۔! گونگو کی منگنی کروالی اور مجھے بتایا بھی نہیں۔! حد ہے۔! ابھی تو اسے تھے پاندھنے نہیں آتے اور لے کر زندہ میں باندھ دیا۔! وہ تاسف سے سر دھننے لگا۔ جب ہی عمیس نے ایک زوردار چمٹ اس کی گردن پہ دھرا۔ وہ ہلکا کر رہ گیا۔

”اے اے اے۔! انگریزوں کے بیچ رہ کر تیرا مارا

”پاؤں نکال اب یا ہر۔ اور کھرے میں دھو۔ آئندہ کے واسطے بندے کا چترنی ہن۔ بوہتی منہ ڈنگا کر کے گٹ مٹ کیتی نا۔ تو سارا شہر پوتا (شوخیان) کھلا رہا (پھیلا) کر رکھ دوں گا۔ سمجھا۔ وڈا آیا۔! کسی کتی تے ولاتی چول چول۔ ہونہ۔! زارون کا بس چلنا تو اتنی شرمندگی اٹھانے سے بہتر تھا کہ پاکستان آنا ہی نا۔ برآمدے کے ستون کی اوٹ میں کھڑی کینڈی اور ثوبیہ بھابی کی ہنسی کی آوازیں مسلسل اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ اس نے خود پر نفرن بھیجی اور بمشکل اپنا تھڑا پاؤں کھینٹ کر کھرے کی طرف چل دیا۔ بتایا ایام اسے انگریز کا نہیں بندے کا چترن کے رہنا ہے۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا۔



فوزیہ پھوپھو کا زارون کی طرف جھکاؤ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں رہا تھا۔ ہر وقت وہ زارون کی تسبیح کرتی رہتی تھیں۔ جتنی دیر وہ گھر میں موجود ہوتا۔ اتنا وقت فوزیہ پھوپھو اس پر پروانہ وار غبار ہوتی رہتیں۔ یہ صورت حال بیکم جمال کے لیے جتنی مایوس کن تھی بیکم اجمل کے لیے اتنی ہی حوصلہ افزا۔ بیکم جمال تو بے جی اور میاں جی کے کلان میں کینڈی اور عمیس کے رشتے کے حوالے سے بات ڈال بھی چکی تھیں اور اس بات کا اندازہ کچھ کچھ فوزیہ پھوپھو کو بھی تھا مگر یہاں پہنچ کر زارون کا بہتر اور روشن مستقبل دیکھتے ہوئے وہ کھلم کھلا ڈالواں ڈول ہوئی جا رہی تھیں۔ جبکہ کینڈی کا رویہ غیر جانب دارانہ تھا۔

حرم اور عمیس اس وقت ایک سی کیفیت میں گھرے کمرہ بند ہوئے بیٹھے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا غم سمجھ ضرور سکتے تھے لیکن کچھ بھی نہیں پارہ تھے۔ عمیس بڑھی شیو اور بلیکے کپڑوں کے ساتھ کمرے میں گھسا پٹا اے المیہ نغمے سن کر غم ہلکا کر رہا تھا۔ آنکھیں موندے نیم دراز سائیکے کو سینے سے لگائے وہ ہو کے بھرنے میں مگن تھا جب زارون بتا دے تک کے

بھی کھوتا ہو گیا ہے۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں۔ اور ہونے والی بھابھی یعنی کینڈی! عہس جلا کٹا سا ہاتھ لہرا کر بولا۔

”لو۔۔۔ وا!“ زارون نے اوکو خاصا لبہ کھینچا۔
”تو یہ معاملہ ہے، جب ہی تو پروفیشن ہوا پڑا ہے۔ تو کینڈی پر لٹو اور کینڈی کی لبائیں مجھ پر۔ ہلہلہ۔۔۔ جی کہ میں نے اوہر آکر تیرا پتا کٹ دیا۔ ہلہلہ۔۔۔“ زارون ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔ ساری کمانی اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اب جب عہس نے اپنا دل کھول کر رکھا تھا تو اس نے بھی سوچا کہ یہ لکے ہاتھوں وہ بھی اپنے دل کی کہہ سنائے تاکہ دونوں کی نیلیار لگ سکے۔ اس نے عہس کی خفا نظروں سے سسم کر بمشکل ہنسی کشول کی اور تھوک نکل کر حملہ ترتیب دیا۔

”ایسا ہے یا۔۔۔ کہ تیری کینڈی تجھے ہی مبارک کیونکہ میں اپنی کھکی پسند کر چکا ہوں۔ مجھے تیری لوکل کینڈی میں کوئی وجہ نہیں!“ عہس جو بے دلی سے اس کا منہ نگے جا رہا تھا۔ زارون کی بات سننے کے بعد اس کا دل کیا کہ اس کا منہ چوم لے۔ وہ مینڈک کی طرح پھدک کے بیڑھے اتر اور کھینچ کر زارون کو کھڑا کیا اور والمانہ گلے سے لگایا۔ اس سے پہلے کہ واقعی وہ جوش التفات میں اس کا منہ چوم ڈالتا۔

”تو سوچ نہیں سکتا یا کہ تو نے مجھے کتنے برس دکھ سے نکالا ہے۔ میرا تو کھانا پینا حرام ہو گیا تھا۔ فوزیہ پھوپھو کا تیری طرف جھکاؤ دیکھ کر میری راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ اب تو سچ سے نکل گیا ہے تو پہلی سارا معاملہ میں سنبھال لوں گا۔ سبکی اور میلانی کو آگے لگانے کی دیر ہے بس۔ اب تو مجھے یہ بتا کہ یہ کھکی کون ہے اور کب سے یہ چکر چل رہا ہے۔ اور غیبت مجھ سے بھی چھپایا۔“ وہ مطمئن اور شلو سا زارون کے کندھے پر مکا جڑتے ہوئے بولا۔ اعصاب یکدم ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔

”بس یا۔۔۔“ زارون نے سر کھاتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ ”اصل میں جس گھر میں میں پے آئی گیسٹ کے طور پر رہ رہا ہوں۔ یہ ان ہی صاحب کی

بھتیجی ہے۔ رہنے والی فیصل آباد کی ہے مگر تیرے صاحب کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے اسٹیشن پاکستان سے وہاں آئی تھی۔ کشمالہ نام ہے۔ پیار سے سب کھکی پوتے ہیں۔ بس وہیں آتے جاتے انڈر اسٹینڈنگ ہوئی اور بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک آ پہنچی۔ اب بس اسے انتظار ہے کہ میں کب گھر کے بزرگوں سے اس بارے میں بات کرتا ہوں اور رشتہ لے کر اس کے گھر آتا ہوں۔ مگر میری ہمت ہی نہیں ہو پارہی کہ میں کوئی بات چھینوں۔ اوپر سے میری والدہ محترمہ۔ فوزیہ پھوپھو کے آگے پیچھے پروانہ وار یوں تار ہو رہی ہیں کہ مجھے نہیں لگتا وہ کھکی کو اتنے آرام سے قہقہہ کریں گی۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کہوں تو کیا کہوں۔“

”لو۔۔۔ تو چچی کی بالکل فکر نہ کر۔ اللہ لوک خاتون ہیں۔ ان کو مٹتا ہائیں ہاتھ کا کام ہے۔ اور فوزیہ پھوپھو سے تو ہماری والدہ میں شروع سے مرعوب رہی ہیں۔ اصل مسئلہ بے جی اور میاں جی سے کھکی کی بات کرنا ہے تو اس مسئلے میں اور بس بھائی کام آسکتے ہیں۔ بس سمجھ ہو گیا یہ مسئلہ حل۔“ عہس نے چٹکی بھالتے ہوئے گویا اس کی مشکل آسان کی تھی۔ زارون نے اسے امید افزا نظروں سے دیکھتے ہوئے سروھٹا۔ اور پھر کچھ یاد آنے پر ایک دم عہس سے پوچھ بیٹھا۔

”یار۔۔۔ ایک بات تو بتا۔ یہ اصرار آج کل کدھر غائب ہے؟ جس دن سے آیا ہوں دکھائی نہیں دیا۔ دو دفعہ گھر بھی چکر لگایا ہے اس کے۔ صرف زینب ٹائی سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی خاصی بیمار بیماری لگیں۔“ عہس سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیا جواب دے۔ حرم اور احرار والے مسئلے سے زارون بے خبر تھا اور حرم آخر اس کی بہن تھی۔ وہ کس طرح زارون کو دونوں کی بہن کی پھیند کی کے بارے میں بتا سکتا ہے۔ اس نے گول مول سے جواب راکھا کیا۔

”ہم۔۔۔ ہم۔۔۔ اکلن دن ہوئے مجھ سے بھی نہیں ملا۔ آج کل کاروبار جمانے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے۔

بتا رہا تھا کہ پونیورٹی سے ریڈائین کر رہا ہے۔
چل دیکھتے ہیں کسی دن مل کر دھرتے ہیں اسے!۔“
زارون کی تو اس نے تسلی کروادی تھی مگر خود یک دم
بے چین سا ہو گیا تھا۔ حرم اور احرار اسے دونوں بے
حد عزیز تھے۔ ایک بہن جیسی کزن تھی تو دوسرا بھائی
جیسا دوست۔ دونوں کی معصوم محبت کا امین تھا وہ۔
مگر حالات نے ایسا پلٹا کھلایا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکا
تھا۔ کچھ دیر پہلے جس دل میں شادمانی کا بھرپور احساس
جاگا تھا۔ ایک دفعہ پھر تاسف نے وہاں گھر کر لیا تھا۔ وہ
بچ میں آزرہ ہو گیا تھا۔

خطرِ نچ کی بساط کے مہرے آج بالکل خاموش پڑے
تھے۔ بے جان، ساکت و جامد! آج کھلاڑیوں کو چال
چلنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نواب حسنین احمد
خان کے تھکے ہوئے اور سلوٹ زدہ چہرے پر اپنی ہار کا
غم ثبت تھا۔ زندگی کے اس موڑ پر ایک دفعہ پھر
حالات اور تقدیر نے مل کر انہیں بچھاڑ دیا تھا۔ ان
کے مقابل بیٹھے ان کے حریف کی نگاہیں مسلسل ان
کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں جو ہرگز بھی دلچسپی
سے عاری نہیں تھیں۔
”آج ہمیں یہ کہنے میں کوئی عذر مانع نہیں کہ ہم
تھک گئے۔ ہم میں اب اتنی سکت نہیں کہ ہم اپنے
ہی خون کو لگا کر سکیں۔ بس! اب ہم ہتھیار چھینکتے ہیں۔“

نواب صاحب نے بے تاثر لہجے میں کہا اور لرزے
ہاتھوں سے بساط الٹادی۔ مقابل نے آنکھیں سکیڑ کر
انہیں دیکھا اور ان کے ہاتھ پر ہاتھ دھرتے ہوئے
رساں سے کہا۔

”یاد ہے میں نے آپ سے کہا تھا کہ خطرِ نچ کی بساط
میں آپ کے ہاتھ ایک بازی ایسی ضرور آتی ہے جس
میں آپ کے سارے مہرے داؤ پر لگ جاتے ہیں۔ وہ
بس ایک موقع۔ ایک موقع۔ سب کچھ لٹا دو۔ یا پالو۔“
نواب حسنین احمد خان کا سارا وجود گویا برف میں

ڈھل گیا۔ یہ شخص کیا ساری عمر انہیں اپنا زیر بار
رکھے گا۔ انہوں نے اپنے مقابل کے پیروں پر
نظریں جماتے ہوئے دکھ سے سوچا۔
”آپ کا آخر ارادہ کیا ہے۔ آپ ہم پر مزید کتنے
احسانات کریں گے۔؟“
”وہ جو مجھوں کا قرض سربراٹھائے پھرتے ہیں نا۔
وہ احسان نہیں کیا کرتے۔ بس خراج چکاتے ہیں۔
وہی میں بھی کر رہا ہوں۔ میرا انتظار بیچے گا۔ یہیں
۔۔۔ اسی بساط پر۔۔۔“
اور وہ چلے گئے۔ پیچھے الٹی ہوئی بساط پر ماتم کنٹاں
نواب حسنین احمد خان کی کنجرتے اٹاچی تھیں۔

”ہمیں پوری امید تھی کہ خون کی کشش آخر آپ
کو ہمارے پاس پہنچ کر لے آئے گی۔ ہمارے دل
کی تڑپ کو آپ کے دل کی کک بننے کی دیر ہے بس،
دیکھو۔ دیکھو شیراقلن! یہ ہے ہمارا پوتا نواب زادہ
احرار حسن خان۔ ذی شان۔“
یہ فخر و غور سے بول رہے نواب تبرک حسین خان کا تھا
جن کی سفاک آنکھوں میں اس وقت محبت کا جہاں
آباد تھا۔ احرار کو دونوں بازوؤں سے تھامے وہ اپنے
بائیں جانب کھڑے اپنے خاندانی ملازم شیراقلن سے
مخاطب تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ احرار پہلی دفعہ اپنے
دادا سے ملاقات کر رہا تھا۔ بلکہ پچھلے ڈھائی ماہ میں وہ
کئی بار یہاں آچکا تھا۔ نواب تبرک حسن خان ٹھیک
تین ماہ پہلے ہندوستان سے پاکستان آئے تھے اور اس
گھر میں رہائش پذیر تھے جو ان کے مرحوم دوست کے
بیٹے کا تھا۔ نواب صاحب کو زیادہ تر وہ نہیں کرنا پڑا
تھا۔ اپنے دوست کے بیٹے کی انیکسی میں قیام کرنے
کے لیے دوست تو کافی عرصہ ہوا فوت ہو چکے تھے مگر
ان کے بیٹے مخدوم محمود قریشی نے ان کا بھرپور خیر مقدم
کیا تھا۔

چند ہی دن میں شیراقلن نے احرار کو نواب صاحب
کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ بس پھر وہ تھے اور ان کی

شاہراہ فطرت کی مہارتیں۔! انہوں نے کچھ اس انداز میں اپنی اور طلال حسن خان کی مظلومیت کے قصے احزار کے گوش گزار کیے کہ احزار بری طرح بدظن ہو گیا۔ نواب صاحب نے سارا ملکہ نواب حسین احمد خان پہ ڈال دیا تھا۔

نواب زاوی عاکشہ یعنی اس کی ماں کی شخصیت کا ایسا نقشہ کھینچا کہ احزار حق و حق بیٹھا رہ گیا تھا۔ اسے تو آج تک کچھ اور ہی پتا تھا۔

”ان ہی پریشانیوں اور تفکرات کے زیر اثر نواب زاوہ طلال حسن خان ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ ریاست کا سارا بوجھ نواب تبرک حسن خان کے بوڑھے کاندھوں پر آن پڑا۔ اور اسی چیز کا فائدہ نواب حسین احمد خان نے اٹھایا اور ان کی ریاست کے وارث ان کے بڑھاپے کی لالچی کو راتوں رات ہندوستان سے غائب کروا کر پاکستان میں خود بھی روپوش ہو گئے۔ طلال خان اپنے بیٹے کے غم میں مر گئے اور انہوں نے اپنی زندگی صرف اور صرف اپنے پوتے کو ڈھونڈنے میں صرف کر دی۔“

احزار کی مربوط اور مضبوط شخصیت دھجیوں میں بکھر گئی تھی۔ واقعات کا ربط اس قدر مستحکم تھا کہ احزار کے پاس ان کی نئی کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی اور پھر اوپر تلے کئی بار کا ملتا آخر رنگ لے ہی آیا۔

نواب تبرک حسن خان ایک دفعہ پھر لقب لگانے میں کامیاب ٹھہرے۔ احزار کلی طور پر اپنے تانا سے برگشتہ ہو چکا تھا۔ اور اب وہ تیار تھا انہیں چھوڑ دینے کے لیے۔ وہ غم و غصے سے انتہا پر ہو چکا تھا کہ اسے اس وقت حرم کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ وہ بس یہاں سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ ہمیشہ کے لیے۔ اور آج وہ یہی سب طے کرنے کے لیے نواب تبرک حسن خان سے ملنے یہاں آیا تھا۔ وہ جلد از جلد پاکستان سے جانا چاہتا تھا۔ جس اذیت اور تکلیف سے وہ اس وقت گزر رہا تھا اس کا ایک ہی حل اس کی نظر میں تھا کہ وہ کھو جائے۔ ہمیشہ کے لیے گم ہو جائے۔

”میں نے سوچ لیا ہے واوا حضور! میں آپ کے

ساتھ ہندوستان جاؤں گا اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ مجھے اب واپس نہیں آنا۔“ بظاہر مضبوطی سے کہتے احزار کے لہجے میں جیسے کالج پڑھتے تھے۔ اور اسے صرف وہی محسوس کر سکتا تھا۔

”بالکل۔ بالکل! جیسا آپ کہیں۔ آپ کا حکم ہمارے سر آنکھوں پر۔ ہم نے یہاں سے جانے کے مکمل انتظامات کر رکھے ہیں۔ بس آپ ہی کے اشارے کے منتظر تھے۔ بس ایک بات کا خیال رہے ہمارے لخت جگر کہ آپ اپنے تانا کو بے خبر نہیں گئے۔“ احزار نے یک دم چونک کر ان کی شکرے جیسی آنکھوں میں جھانکا۔ اور حیرت سے انہیں دیکھا۔

”ہم نہیں چاہتے کہ وہ راہزن آپ کے ارادوں کو کمزور کرے۔ آپ شش و پنج میں مبتلا ہو جائیں۔ دوسرے ہم چاہتے ہیں کہ انہیں وہی اذیت دے کر کے یہاں سے کوچ کریں جو گزشتہ کئی سالوں سے ہمارے حصے میں آئی ہوئی تھی۔“

اپنے ایک اہلکار کو اچکاتے ہوئے اور مونچھ کا کونا موڑتے ہوئے نواب تبرک حسن خان سامنے دیوار پر آویزاں ڈوبتے سورج کے عکس کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ان کا لہجہ لطف لیتا ہوا تھا۔ حفاٹھا تا ہوا۔ احزار کو ایک عجیب سی ناگواری کا احساس ہوا۔ اس کا ہرگز ایسا ارادہ نہیں تھا کہ وہ اپنے بوڑھے تانا اور نانی کو ایسی کڑی سزا دیتا۔ (حالانکہ سزا تو وہ ابھی بھی دے رہا تھا) ایسا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انہیں بے خبر رکھ کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے۔ لیکن نجانے کیوں فی الوقت اس نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔ اسے گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ نواب تبرک حسن خان مسلسل شیراز گلن اور اس کے ساتھ آئندہ کے لائحہ عمل پر گفت و شنید کرتے رہے۔ وہ بس ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا اور آخر کار اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں اب چلوں گا واوا حضور! آپ مجھے فون پر تاریخ، دن اور وقت سب بتا دیجیے گا۔ میں پہنچ جاؤں گا!“ نواب صاحب نے اس مضبوط چوڑی ہچاتی والے

کو اپنے سینے سے لگایا۔ چند پل اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔ طلال خیل کا عکس تھا وہ۔ صرف چہرے پہ رعوت نہیں تھی۔

”آجائے گی۔۔۔ آجائے گی۔۔۔ ایک دفعہ ہم اپنے بولنے کو یہاں سے نکل لے جائیں۔ اپنی ریاست کی گدڑی پر بٹھادیں تو پورے کدو فرے ساتھ حکومت کرنا ہم سکھادیں گے۔“ نواب صاحب نے دل ہی دل میں اپنی بلاتنک خود پرواضح کی اور اپنے پوتے کو رخصتی کا ہند یہ دیا۔

احرار پلٹ کر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ یہ کو ریڈور تھا اور نیم اندھیرے میں تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا تھا کہ یکدم پرشت سے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور سمجھ کر کچھ فاصلے پر لے گیا۔

صرف ایک لمحے کو احرار بدحواس ہوا تھا مگر اگلے ہی پل اس نے پلٹ کر قاتل پر وار کرنا چاہا تھا اور اسی لمحے جیسے زمین اس کے پیروں کے نیچے سے سرک گئی۔

”کیا جمل۔۔۔ آپ؟“

”ہاں میں۔! کیوں ٹی کیوں کم ہو گئی صاحبزادے؟“

”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟“ وہ خیر زندہ سا پوچھ رہا تھا۔ جواباً ”کیا جمل نے دھیمی سی مسکن ہونٹوں پہ چلتے ہوئے کہا۔“

”میں تو اس دن سے باخبر ہوں جس دن آپ نے یہاں پہل دفعہ اپنے پتا جان سے چپکے قدم رکھا تھا۔ بس آپ ہی بے خبر رہے۔ ہر احساس سے اور ہر حقیقت سے۔“

”میں بے خبر پہلے تھا۔ اب نہیں! وہ تنفر سے سر جھمکتے ہوئے بولا۔“ میرا سارا بچپن اسی کرید میں گزر گیا کہ میرا باپ کون ہے؟ کہاں ہے؟ ان کے کمال باپ کون ہیں؟ پتا جان نے ہمیشہ مجھے اپنی ذات کے گرد الجھائے رکھا۔ میرا باپ میری یاد میں سسک سسک کر جان کی بازی ہار گیا۔ اور اب یہ داوا کا بوڑھا وجود۔! یہ بھی تشنہ کافی کے سائے میں اپنی آخری

سانس پوری کر لیتے جو اتفاق سے مجھے کھوج نہ لیتے۔“

”اتفاق سے نہیں۔ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہیں۔! کیا جمل نے قدرے سنجیدگی کے ساتھ نوکتے ہوئے کہا۔

”جو بھی ہو۔ لیکن اب میں ان ہی کے ساتھ ان ہی کے پاس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

”ہم۔! اچھی بات ہے۔ آپ نے جو بھی فیصلہ کیا ہے یقیناً ہر پہلو سے سوچ سمجھ کے ہی کیا ہو گا۔ اور ظاہر ہے آپ نے اپنے پتا جمل کی پھر نہ سلی کو بھی خوب دھیان میں رکھا ہو گا۔ ہے میں؟“ ان کے دھیمے لہجے میں کیے استفسار پر احرار کسم کسم کر رہ گیا۔

اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

”انہوں نے آپ کو کھودینے کے ڈر سے اپنی جائیدادیں بیچ ڈالیں اور ایک طرح سے روپوشی کی حالت میں زندگی گزار دی۔ اور اب جب آپ جوان ہو چکے تو یہی صلہ ملنا چاہیے تھا انہیں کہ آپ ان کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائیں۔ اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ ایک بیٹا تو فضا میں منتشر ہو گیا۔ لاش بھی نہ ملی اور بیٹی! آپ کی والدہ۔۔۔ انہیں نواب خاندان کے محل میں پٹنے والی سازشوں نے نگل لیا۔ لاش تو دور کی بات۔ قبر کا سراغ بھی نہ مل سکا۔ اچھا ہوا۔ بہت صحیح ہوا۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا ان دونوں میاں بیوی کے ساتھ۔ یہ اسی قاتل تھے۔“

بولتے بولتے کیا جمل کی سانس پھول گئی۔ چہو شدت جذبہ سے دکھتا انگارہ بن گیا۔ ویسے بھی وہ بے حد بچنے لہجے میں بات کر رہے تھے کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں ان کی آواز اندر کمرے میں موجود نواب تہرک حسن خان کے کانوں میں نہ پہنچ جائے جبکہ کھیل ابھی باقی تھا۔

احرار کے ماتھے پر پسینے کے چند قطرے نمودار ہوئے۔ جنہیں اس نے ہاتھ سے پونچھ ڈالا اور سرسرائی آواز میں گویا ہوا۔

”میری والدہ نے تو ملکوں سی زندگی بسر کی۔ وہ شادی کے کئی برس تک ولادہ ہی پیدا کرنے کے حق میں نہ تھیں۔ بلکہ میری پیدائش کو لے کر بھی وہ خاصی ناخوش تھیں۔ کئی بار انہوں نے حمل کے دوران ہی مجھے نقصان پہنچانے کی بھی کوشش کی۔ وہ تو اتفاق ایسا ہوا کہ میری پیدائش کے وقت ہی ان کی موت ہو گئی ورنہ شاید وہ زندہ رہتیں تو کبھی بھی مجھے نہ اپنائیں۔ میرے والد طلال حسن خان چونکہ ان سے بے حد محبت کرتے تھے اور ان کی غلط روش کی وجہ سے خائف بھی تھے لہذا ان کی اچانک موت نے ان کے ذہن کو مفلوج کر ڈالا۔ اور وہ بھی عین جوانی میں دلغی مفارقت دے گئے۔ اس کے بعد بتا جانے لگے کہ انہما کردی اور مجھے میرے آپائی محل سے اخراج کر لائے! کیا ایسا ہی نہیں ہوا جمل تیا۔ بولے۔ کیا میں نے یہ سب غلط کیا؟“

”آپ کا میزبان مخدوم محمود قریشی میرا جگری دوست ہے لہذا اس نے میرے ہمراہ آنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ویسے میرے تعارف کے لیے انتہائی کافی ہے کہ میں نواب حسین احمد خان کے بے حد قریبی عزیزوں اور خیر خواہوں میں سے ایک ہوں۔ میرا بچپن ان ہی کے سامنے کھیل کر جوان ہوا ہے۔ میرا پہلا آنے کا مقصد محض یہ جانتا تھا کہ۔“

”کہ ہم نواب زادہ احرار حسن خان کو کیوں ورغلا رہے ہیں۔“ ”یکدم نواب صاحب نے جمل صاحب کو لوک کر جملہ مکمل کیا تھا۔ انداز میں لاپرواہی اور بے نیازی چہنچہ کی حد تک زیادہ تھی۔ جمل صاحب کے ہونٹوں پر بڑی نفیس سی مسکراہٹ آ کر چھبر گئی۔ وہ بے حد محل سے گویا ہوئے۔

”نہیں، ہرگز نہیں! احرار آپ کا پوتا ہے، آپ کا خون۔ اس پر حق ہے آپ کا۔ نواب حسین احمد خان بخوبی جانتے ہیں کہ ان دنوں وہ آپ سے نہ صرف مل رہا ہے بلکہ وہ آپ کے ہمراہ ہندوستان جانے کا بھی خواہش مند ہے۔ انہیں اس بات پر چنداں اعتراض نہیں۔“

”احرار میکا کی انداز میں پوری کہانی لفظ بہ لفظ ویسے ہی سنا تا چلا گیا جیسے نواب تہرک حسن خان نے اس سے کہی تھی۔ اور اب آخر میں وہ تڑھل سا سوال کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اندیشے ہلکورے لے رہے تھے۔

”ایک بل کو ان کے کئی میں آیا کہ کس کے ایک تھپڑ احرار کے چہرے پر لگائیں۔ مگر وہ جتنی کے ساتھ اپنی مٹھی بچھ کر کھڑے ہوئے۔ وہ کیسے اس چہرے کو گزند پہنچاتے جس میں نواب زاوی عاتش جھلکتی تھیں۔ ایک طویل سانس بچھ کر انہوں نے خود کو قدرے نارمل کیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔

”اس کمرے کے دروازے سے ایک لڑکچ بھی ادھر ادھر مت سرکنا۔ بس کلن لگائے رکھنا۔ آپ پر سب کی اصلیت کا پل کھل جائے گا سا جہاز سے! یہ کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے احرار کا ہاتھ تھما اور دھپاؤں چلتے دروازے کے قریب چلے آئے۔ ایک نگاہ اس کے پریشان چہرے پر ڈالی اور اس کا کاندھا تھپتھا کر دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہو گئے۔ یوں کہ اسے اتنا کھلا رہے دیا کہ اندر کی آواز

لائے ہوئے جاں بحق ہو گئیں۔
احرار کی زندگی بھی جو وہ بچ گیا مگر نہ جس پوتے کو
جھوٹی کمائیاں بنا کر آپ ہندوستان لے جا رہے ہیں
۔۔۔ آج اس کا بھی نام و نشان نہ رہتا۔ نواب حسنین
احمد خان اور ان کی بیگم کو بیٹی کا آخری دیدار بھی نصیب
نہ ہو سکا۔ اور اس حد تک یہاں سلوک کے بعد بھی
آپ فرماتے ہیں کہ انہیں ان کی بیٹی عاتشہ کی لحد تک کا
پتہ نہ دیں گے۔ ان کی بیٹی کی آخری نشانی تو آپ ہتھیا
کر لے جایا رہے ہیں۔ پھر بھی آپ کا دل اس قدر
بے رحم ہے۔“

نواب تبرک حسن خان مارے طیش کے اٹھ
کھڑے ہوئے صندلی چھڑی پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ
ڈال کر اپنی ازلی رعونت سے گویا ہوئے۔
”ہمیں تب تک چین نہیں پڑے گا جب تک
ہمیں ہندوستان میں یہ اطلاع نہ مل جائے کہ نواب
حسین احمد خان اپنے نواسے کی یاد میں جان سے گزر
گئے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہمارا بیٹا عین جوانی میں اپنی
اولاد کے غم میں جان سے گزر گیا۔“

”اپنی اہلاد کے نہیں نواب صاحب۔ اپنی بیماری
اور دن رات کی بے نوبی کے باعث۔ اور اگر ایسی
ہی بات ہے تو جوان اولاد کے گزر جانے کا صدمہ تو
نواب حسنین احمد خان نے بھی سہا!“ جمال صاحب
بات کانٹے ہوئے بولے۔ نواب تبرک حسن خان
نے بل کے بل نگاہ چرائی مگر ان کا خیر ہی سفاکی سے
اکٹھا تھا۔ گردن اکڑاتے ہوئے بولے۔

”ہمارے ہاں بیٹیاں۔۔۔ نواب خاندان پر قربان
ہونے کے لیے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ نواب زادی عاتشہ
اگر مر گئیں تو ایسا بھی کیا غضب ہو گیا۔ ہمارا
احسان بانٹنا چاہیے نواب حسنین احمد خان کو کہ ہم نے
ان کی بیٹی کو نواب خاندان سے باہر نہیں جانے دیا۔
ان کی قبر کے کتبے پر زوجہ نواب زادہ طلال حسن خان
لکھا ہے۔ اور کیا چاہیے!“

عاتشہ کا ذکر اس انداز میں ہوا۔ بھلا جمال صاحب کو
کب گوارا ہوا تھا۔ آنکھیں میچتے اور مٹھیاں جھپٹتے وہ

بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سس خنوروں
والی آنکھوں میں نمی کی واضح تہ تھی۔ ایک دفعہ پھر
عاتشہ کی بے کسی اور کرب ناک موت کا خیال ان کے
دل کی رگوں کو کاٹ گیا۔ ایک گیلہ سا طویل سانس
کھینچ کر بے شکل خود کو مربوط کیا۔ بس! اب بھیل
سمیٹ دینا چاہیے۔۔۔
”احرار۔ اندر آؤ۔“

دروازے کے پیچھے سے احرار کا چہرہ نمودار ہوتے
ہی نواب تبرک حسن خان کا چہرہ برق ہوا تھا۔ وہ
لڑکھائے تھے۔ شیراقلن نے فوراً آگے بڑھ کر
انہیں سنبھالا دیا مگر یک دم ان کی ٹانگوں میں ایسی
لرزش اتری کہ انہیں واپس کر سی پر بٹھا دیا۔ وہ سفید
ہونٹوں اور پھٹی آنکھوں کے ساتھ یک ٹک احرار کا
چہرہ کے چارے تھے جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی
قطار لگی تھی۔ وہ سب کچھ سن چکے اس بات کی
تصدیق کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ کیسی مات دی
تھی قسمت نے انہیں۔ فارغ بن کر آئے تھے۔
سکندر بن کر جانا تھا مگر عین وقت پر بازی پلٹ گئی تھی۔

اف۔! وہ کیسے بھول گئے کہ ابھی چند منٹ پہلے تو
ان کا پوتا اس کمرے سے باہر گیا تھا۔ وہ کہیں قریب
ہی ہو سکتا تھا۔ واپس بھی آسکتا تھا۔ کچھ سن بھی
سکتا تھا۔ اور اس نے سب ہی کچھ سن لیا تھا! کوئی
ایسے بھی ہارا ہو گا جیسے انہیں شکست ہوئی تھی۔
چاروں شانے جت۔ ایک دم جت۔!

وہ اپنی صفائی میں کیا کہتے؟ ان کی زبان تو بکلی معنی تھی
جیسے۔ شیراقلن بھی پتھر کا مجسمہ بنائی سرکار کی پشت
پر کھڑا نیچے فرش پر بچے ابرائی قالین کو کھورے جا رہا تھا۔
اس میں نواب صاحب کا چہرہ دیکھنے کی ہمت ختم ہو
گئی تھی۔

”میں آپ سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں کہنا ہی
نہیں چاہتا۔ صرف ایک خواہش شدت سے دل میں
اٹھ رہی ہے کہ کاش میں بھی اپنی ماں کے ساتھ ہی قبر
میں اتر گیا ہوتا۔“

گئے۔ پیچھے کمرے میں اعصاب شکن خاموشی تھی...
ماتمی خاموشی۔ ایک بت پاش پاش ہوا تھا۔ جو
آپ اپنا چپاری تھا۔ خدائی چھوٹی تھی۔ جو محض خود
ساختہ بڑائی تھی۔



آج رات احرار گھر نہیں آیا تھا۔ اور نہ منبہ کی کو
صبر نہیں کیا تھا۔ ساری رات دونوں میاں بیوی نے
ہال کمرے میں بیٹھے گزار دی۔ نواب حسین احمد خان
نے خود کو لادوا ظاہر کیا تھا۔ یوں جیسے وہ جانتے تھے کہ
ایک دن احرار انہیں چھوڑ کر چلے و لالہ تو ہے ہی۔ سو
وہ چلا گیا۔ مگر دل میں کہیں ایک چھوٹی سی امید ٹھٹھاتی
رہی تھی کہ شاید وہ ابھی نہ گیا ہو شاید وہ اپنا
ارادہ بدل دے۔

منبہ کی کو ساری رات وہ کمرے میں جا کر آرام
کرنے کا کتنے رہے مگر وہ کہیں فجر کی آوازوں کے ساتھ
ہی وہاں سے انہیں لودہ بے حد ڈھل سی۔ دونی۔
بسکیں لیتی کمرے میں چلی گئی تھیں۔ لودہ وہ
کمرے میں گئیں اور لودہ نواب صاحب کی آنکھیں
چھلک گئیں۔ چند آنسو ہما کے۔ بڑی بے دردی کے
ساتھ آنکھوں کو انگلیوں کی پوٹوں سے رگڑ ڈالا۔ خود
اٹھ کر مسجد کا رخ کیا۔ ملازم لڑکا اپنے کوارٹر میں تھا۔
اسے آواز دینا مناسب نہ سمجھا اور خود ہی آہستہ کی
ساتھ گیٹ کھولا اور یوں ہی پیدل ہی کڑا کے کی سردی
میں مسجد نکل لیے۔



برکت اللہ صاحب نے پوچھنے سے پہلے بھینس کی
خاطر داری کی۔ اس کے چارے پانی سے فارغ ہو کر
برآمدے میں سکتی آٹھ شیشی کے پاس کھڑے ہو کر نماز
ادا کی اور شہر د (پانٹو بلا) کو بغل میں دیا کر گیٹ سے باہر
تھڑے پر چھٹی چابوٹی پر لطف اڑھ کر۔ گلو تکیے
سے کہنی نکا کر۔ بڑے مست انداز میں حقے کے کش
لینے لگے۔ یہ ڈیوٹی بھی کئی دن سے زارون ہی ادا کر رہا
تھا۔ فجر کے وقت مسجد جاتے ہوئے تھڑے پر چابوٹی

ٹپ ٹپ۔ دو قطرے۔ دو قطرے پانی کے زندگی
میں پہلی بار نواب حیرک حسن خان کی آنکھوں سے
نکلے تھے۔ جو ان کے سنگی چہرے پر بے حد اجنبی
محسوس ہو رہے تھے۔

”میں نے آپ کی چھوٹی داستان الم سن کر اپنے نانا
اور نانی کے دل چھلتی کر دیے۔ اسنے لفظوں کے
تیروں سے۔ اتنا سفاک اور بے رحم ہو گیا تھا میں۔
ظاہر ہے خون کا اثر تو آتا تھا مجھ میں۔

میں نے ان کی کئی سالوں کی تربیت کے منہ پر
طمانچہ دے مارا۔ اور آج پلٹ کر وہی چھڑ میرے منہ
پر پڑا ہے۔ تھ ہے مجھ پر۔ کہ میں نے آپ کی
باتوں میں آکر اپنی پاکیزہ اور بے قصوریاں تک کے لیے
برا سوچا۔ غلط قیاس کیا۔ میں اس کے لیے خود کو کبھی
معاف نہیں کر دوں گا۔ اور آپ کو میں آپ کے ضمیر
کے حوالے کرتا ہوں۔ یہی سزا آپ کے لیے کافی ہے۔“

کسی چھوٹی بچی کی طرح اپنی آستین سے آنکھیں
بوچھ کر بغیر کسی کو دیکھے وہ تیزی سے کمرے سے باہر
نکل گیا۔ جمال صاحب نے تفس سے نواب حیرک
حسن خان کے حیرت سے ادھر سے چہرے کو دیکھا۔
جس کی سفیدی واضح طور پر زردی میں تبدیل ہو رہی
تھی۔

”نواب صاحب! زندگی خطر کی وہ بساط ہے جس
میں آپ کے ہاتھ ایک بازی ایسی ضرور آتی ہے جب
آپ کے سارے سرے دھڑ پر لگ جاتے ہیں۔ اور
یہی وہ وقت ہوتا ہے جب تقدیر آپ کو ایک موقع دیتی
ہے۔ تدبیر کرنے کا۔ وہ ایک موقع! جس میں آپ
سب کچھ گنوا دیں یا پالیں! میں تمام عمر اپنی تقدیر سے
کبھی نہیں الجھا مگر آج وقت نے تدبیر کا جگنو میری
مٹھی میں لا ڈھالیا۔ یہ بازی آپ جیت سکتے تھے جو
بدنیتی کا مظاہرہ نہ کرتے۔ آپ نے اپنے سرے خود
ہی پڑا لیے نواب صاحب! اب اجازت دیجیے۔ چلتا
ہوں۔ لیکن آپ کے لیے دعا گو رہوں گا۔“
جمال صاحب آزرہ سے سر جھکا کے وہاں سے چلے

بھی بچاتا اور حقہ بھی سلگا کے دیتا۔ آج کل وہ میاں جی کو رام کرنے کے ایک سوا ایک طریقوں پر عمل کر رہا تھا۔!

ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ صرف صبح کا ہلکا ہلکا اجالا نمودار ہوا تھا۔ حقے کے لمبے سے کش کے بعد چھوڑے گئے دھوکے میں میاں جی کو ایک ہولا سا دکھائی دیا۔ آنکھیں جتنی کر کے دیکھا تو بے اختیار چنگارہ سا بھرا۔

”بڑے دن بعد نظر آیا۔ اپنا کپوتر۔!“
نواب حسین احمد خان کو آنا دیکھ کر وہ شیرو کی گردن سلاتے ہوئے بیڑی لائے۔ نواب صاحب کا چہرہ اترا ہوا تھا اور قدم بھی ڈھیلے پڑ رہے تھے۔ اپنے گھر کے گیٹ کے قریب آتے آتے ٹانگوں نے تھکا سا کھلیا۔ وہ لڑکھائے۔ لگاؤ چند فٹ دور چا پائی پہ مزے سے نیم دراز برکت اللہ کے مسکراتے چہرے پر پڑی۔ ایک وقت تھا کہ یہ چہرہ لگا ہوں سے او بھل ہو جاتا تو چین نہ پڑتا تھا۔ اور اب یہ وقت ہے کہ کسی دن دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تو سارا دن بیڑی لگتے جاتے۔ ان کا یاد اندہ گردن نہانہ کی غنڈ ہو گیا۔ نواب حسین احمد خان کی آنکھیں بھر آئیں۔ لمبے کے ہزاروں حصے میں ان کے دل نے خواہش کی کہ ڈوبنے سے پہلے اپنے یار کو آواز دیں۔ اس کے سینے پر سر رکھیں اور پھر بھلے وقت کی مٹائیں ہاتھ سے جھوٹ جائیں۔!

برکت اللہ کے دونوں ایندو تن گئے۔ مسکراہٹ مٹ گئی اور دل نے کسی انمولی کے احساس سے ہلکوللا سا کھلیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر حسین احمد کو دیکھے گئے۔ کچھ ہو رہا تھا۔ ہاں کچھ ہو چلا ہے۔ برکت اللہ نے حسین احمد کو سڑک کے پھول بیچ کرتے دیکھا۔ ایک بھینجی بھینجی سی آواز ان کے منہ سے خارج ہوئی اور وہ کسی چست و ہوشیار کرتب باز کی مانند لحاف اچھالتے پھولا ٹنگ سی مارتے حسین احمد کی طرف لپکے تھے۔ ان کے سر کو بچنے سے اٹھا کر اپنی گود میں دھرا۔ اور اب کے بولے تو آواز قدرے پھٹی ہوئی سی تھی۔

”اوئے۔ اوئے! ہوش کر میرے یار۔ کی ہویا تجھے۔؟“ ان کے گل پتھیتاے ہوئے برکت اللہ نے ایک زور دار پکار اور پس اور عیس کو لگائی۔ حسین احمد کی زبان بل کھائی ہوئی تھی اور اذیت سے ان کے چہرے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ ہاتھ سے دل دالی جگہ کو تھام رکھا تھا۔

”اوئے کپوتر! مجھے نیڑے (قریب) بلانے کے بہانے نہ بنا۔ میرا نام (غصہ) ایسے نہیں اترنے والا۔ اکھاں کھول۔ اوئے کھول اکھاں۔!“

برکت اللہ مسلسل چہرہ پتھیتاے اور ہاتھ ملتے ہوئے بولے جا رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو تھے، لب پھر پھر اڑ رہے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے ان کا سینہ ہی طرح جکڑا گیا ہے۔ حسین احمد کی تکلیف انہیں اپنے دل میں محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ دھیرے سے حسین احمد کے کاتھے سے نکالیا اور بارے ہوئے لمبے میں بولے۔

”کل سن میری۔! مجھے جھڑکنے نہ جا۔ لے میں نے ہار من لی۔ توجیت گیا کپوتر۔ لیکن اب لمبی اڑاری نہ مار۔ یا راساری عمر کل گئی دور دور سے نکلتے۔ آج میرے کول ہی تو تھ نہ چھڑا۔ تجھے یاد ہے۔ میں نے تیرے سے وعدہ لیا تھا کہ میری منجی کو موڑنا تھا تو نے دینا ہے۔ توبہ کرنے کہ۔ ہوش کر دیا۔ میں کیسے جیوں گا تیرے سے لڑنے بغیر۔ رس کے نہ جا پار۔!“

جیسے جھوٹا بچہ اپنا ٹونا کھلونا ہاتھوں میں لیے بے بسی سے سسکا اٹھا ہے۔ بالکل ویسے ہی برکت اللہ حسین احمد کا سر گود میں دھرے آنکھیں میچے روئے جا رہے تھے۔ انہیں کچھ ہوش نہ رہا کہ کب اور پس نے گاڑی ان کے قریب لا کر روکی۔ عیس کے ساتھ مل کر بھاگ بھاگ حسین احمد کو گاڑی میں ڈالا، اگلی سیٹ پر برکت اللہ کو زبردستی سڑک سے اٹھا کر بٹھالیا۔ جمال نیا کے بیٹھے ہی اور پس نے گاڑی دوڑا دی تھی۔ اگلے دس منٹ میں قریبی ہسپتال کے کارڈیالوجی وارڈ میں حسین احمد ڈاکٹر زکے رحم و کرم پر

تھے۔ جبکہ باہر ٹھنڈے بخ بیچ پر بیٹھے برکت اللہ
روتے کر لاتے ایک ہی گردان کیے جا رہے تھے۔
رس کے نہ جایا راسے!



نواب حسنین احمد خان کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔
اس وقت وہ سی سی یو میں تھے۔ اگلے بارہ گھنٹے ڈاکٹرز
نے اہم قرار دیے تھے۔ گھر اطلاع پہنچے ہی بے جی
زیب لی، حرم اور فوزیہ پھوپھو کو لے کر زارون کے
ساتھ ہسپتال پہنچ گئی تھیں۔ پیچھے بچوں کے پاس
ٹوبہ بھابی اور کینڈی تھیں، عمیس مسلسل احرار
سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا سیل آف
تھا۔

بڑی تگ و دو کے بعد اس کے ایک کولیک سے
رابطہ ہوا تھا جس نے صبح احرار کو ملے جلے حلیے میں
بے حال سیونیورٹی کی لائبریری کی طرف جانے دیکھا
تھا۔ عمیس نے کولیک سے نواب صاحب کی حالت
بیان کرنے کے بعد درخواست کی تھی کہ کسی طرح
احرار تک یہ خبر پہنچا دے۔

اس نے دس سے پندرہ منٹ انتظار کرنے کو کہا تھا۔
ٹھیک گیارہویں منٹ اس کی کال آگئی کہ احرار
یونیورٹی سے نکل چکا ہے!

زارون اور عمیس کڑے تیور لیے ہسپتال کی
انٹرنس پر جا کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں کا ارادہ اسے
آڑے ہاتھوں لینے کا تھا۔ تھوڑی دیر مزید انتظار کے
بعد انہیں اس کی ہوائیاں اڑی صورت دکھائی دی۔
وہ نہ صرف بوکھلایا ہوا تھا بلکہ یقیناً "رویا ہوا بھی تھا۔
زارون اور عمیس کو دیکھ کر وہ تقریباً "بھگتا ہوا ان
تک پہنچا تھا۔ بڑی بے چینی سے تانا جان کا پوچھا تھا۔
ان کی سنجیدہ شکلیں اس کو ہولا رہی تھیں۔

عمیس کا جی چاہا کہ ایک نوردار مکا اس کے جڑے پہ
ٹھونک دے۔ وہ عمل در آمد بھی کر مگر تا لیکن اس
وقت جمال تیار وہاں چلے آئے۔ دونوں کو آنکھوں
سے ٹھنڈے رہنے کا اشارہ کیا اور احرار کے کندھوں پر

بازو پھیلائے اسے اندر لے کر چلے گئے!۔
کو ریڈور میں بے جی کے ساتھ زیب لی اور حرم
موجود تھیں۔ حرم نے اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا تھا۔
وہ پہلے ہی دکھ کا شکار تھا، مزید اذیت میں گھر گیا۔ سی
سی یو کے دروازے میں لگے شیشے کے بار نواب حسنین
احمد خان کے بے حس و حرکت وجود کو دیکھتے ہی وہ خود پر
سے کنٹرول کھو بیٹھا۔ جمال تانا کے گلے لگ کر ایسا
بلک بلک رویا کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

میاں جی جو بڑی ضد کر کے سی سی یو کے باہر ہی لگے
بیٹھے تھے۔ اپنی جگہ سے اٹھے۔ جمال تانا کے سینے
سے لگے احرار کو بھیج کر اپنی طرف پھیرا اور زندگی میں
پہلی بار اسے پوری آملا کی اور محبت کے ساتھ سینے سے
لگا کر بھیج لیا۔ دونوں کی ہچکیاں بندھی تھیں اور دونوں
نجانے کیا بیڑائے جا رہے تھے۔ جمال تانا نے اپنی
آنکھوں کی نمی انگلیوں کی پوروں سے صاف کی اور چہرہ
آسمان کی طرف اٹھا کر پورے دل سے مسکرا دیے۔
یوں جیسے کسی ناویدہ وجود کے ساتھ مسکراہٹ کا تبادلہ
ہوا تھا! وہ کوئی باہر کھلاڑی نہیں تھے مگر جن کے سر میں
عشق کا سودا سلایا ہو۔ وہ داؤ کہاں آزماتے ہیں، جگر
آزماتے ہیں اور تخت تخت ہو جاتے ہیں۔



سارے حالات آنا "فانا" بد لے تھے۔ پلک جھپکنے
میں جیسے کسی نے جاو کی چھڑی گھمائی تھی اور منظر بدل
گئے!

نواب حسنین احمد خان دل کے شدید دورے سے
جانبہ ہونے کے بعد ڈسچارج ہوئے تو برکت اللہ
پورے مان کے ساتھ انہیں سیدھا اپنے ہی گھر لے
آئے۔ بے جی کی خود ساختہ ناراضی کسی کو نے میں جا
کھسی۔ وہ اتنی خوش تھیں کہ میاں جی کو سو خون
معاف کر دیتیں۔ سارا دن زیب لی ہوتیں اور وہ
ہوتیں۔ گھر کی عورتیں نواب صاحب کی خدمت
میں پیش پیش تھیں۔ اور میاں جی تو جیسے نواب
صاحب کو گود لے بیٹھے تھے۔ بالکل اس طرح سے

منطقی بھی کریں۔ مگر میاں جی نے سہاؤ سے منع کر دیا۔۔۔ شادی میں دو ہفتے ہی تو تھے لہذا سارے شوق اور ارمان تب تک کے لیے ملتوی کر دیے۔۔۔ احرم احتجاجاً ایک بار پھر کرہ بند ہو گئی۔ دیکھ تو یہ تھا کہ عمیس جیسے غم خوار نے بھی پیٹھ دکھادی تھی۔!

فوزیہ پھوپھو آج کل بے جی کے خوب آگے پیچھے تھیں۔۔۔ وہ زارون کے حوالے سے بات کرنا چاہتی تھیں۔۔۔ انہوں نے اپنے میاں۔۔۔ ارشد صاحب کو بھی دونوں ہونے بلوایا تھا۔۔۔ ویسے بھی اگلے ماہ وہ کینڈا جانے والے تھے سو ملنا ملنا بھی ہو جاتا۔۔۔ بے جی بھی کانیاں تھیں۔۔۔ سب سمجھتی تھیں وہ عمیس اور کینڈی کے دلوں سے بے خبر نہیں تھیں۔۔۔ پھر ایسی صورت میں جبکہ زارون بھی میاں جی اور بے جی کو اعتماد میں لے چکا تھا اور تو اور جمال نیا بھی اس راز میں شریک تھے تو پھر بے جی کیسے اپنے دونوں پوتوں اور نواسی کا دل اجاڑیں۔۔۔ اس سے پہلے کہ فوزیہ پھوپھو کوئی ذکر چھیڑیں۔۔۔ بے جی اور میاں جی نے جمال نیا کے ساتھ مل کر ارشد صاحب سے عمیس کے لیے کینڈی کا رشتہ طلب کر لیا۔۔۔ ارشد صاحب تو پھولے نہ سائے کہ سرال والوں نے اپنی بیٹی سے ہٹ کر داماد کو اس قدر اہمیت دی ہے۔۔۔ وہ اتنے شوخے ہوئے کہ اسی لمحے ہاں کہہ دی۔۔۔ ایک دم سارے میں مبارک سلامت کا شور اٹھا۔۔۔ بیگم جمال نے آگے بڑھ کر فوزیہ

خیال رکھ رہے تھے جیسے کوئی ماں اپنے نوزائیدہ بچے کا رکھے۔۔۔! دونوں دوست ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ماضی کھنگالتے رہتے اور آنکھوں میں نمی چمکتی رہتی۔۔۔ نواب صاحب کی بیماری ایک ایسا جھٹکا ثابت ہوئی تھی جس نے کبھی کی جام ہوئی دوستی کی گاڑی دوڑادی تھی۔!

اور اب میاں جی کسی بھی معاملے کو التوا میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔۔۔ پہلی فرصت میں انہوں نے ڈاکٹر بلال کے گھر والوں سے حرم کے رشتے کے لیے معذرت کی تھی۔۔۔ گو کہ یہ خاصی معیوب حرکت تھی کہ شادی میں وقت ہی کتنا رہ گیا تھا مگر ہر بار کی طرح میاں جی نے بے جی کے کندھوں پر بندوق دھردی۔۔۔ انہیں غصہ تو بے حد آیا مگر پناہ دیا کیونکہ خود بھی تو وہ یہ ہی چاہتی تھیں۔۔۔! وضع دار لوگ تھے۔۔۔ راتو بے حد مانا مگر تکرار میں نہیں پڑے۔۔۔ خاموشی سے سلمان بھجوا دیا اور اپنا منگو الیا۔۔۔ ڈاکٹر بلال کو عمیس اور احرار نے سنبھال لیا۔۔۔ پالا ہی پالا اس کے کلینک میں اس کے روزہ بیٹھ کر۔۔۔ باتوں کی کچھ مٹھی، کچھ میٹھی اور ذرا سی کڑوی خوراک دے کر چلے آئے۔۔۔ عمیس نے احرار کا تعارف حرم کے ہونے والے شوہر کے طور کروایا، ساتھ ہی دونوں کی باہمی رضامندی کا ذکر کیا تو ڈاکٹر بلال جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔۔۔ بھلا وہ پرانی زمین پر مکان کیسے تعمیر کر سکتا تھا۔!

حرم کو معلوم ہوا تو اس نے ہر قسمی بی لوائسٹوری کی طرح خوب واویلا کیا اور صاف انکار بھی کر دیا۔۔۔ بے جی نے انکار سن کر ناگ بر سے کبھی اڑائی۔۔۔ بیگم جمال نے لاہروائی سے سر جھٹک دیا اور بیگم اجمل نے غصے سے گھورنے پر اکتفا کیا۔۔۔ اس کے علاوہ کسی نے بھی کچھ نہ کہا۔۔۔ کسی کو بھی حرم کے انکار سے ہرگز دلچسپی نہیں تھی۔!

میاں جی نے شادی کی وہی تاریخ رکھی جو پہلے سے طے تھی۔۔۔! نواب حسین احمد خان اپنے گھر شفٹ ہو چکے تھے اور چاہتے تھے کہ نواسے کی دھوم دھام سے



مستریجا
مہیما

قیمت - 400 روپے

کتبہ مرآت لاہور: 37-38 - 39-40 - 41-42 - 43-44 - 45-46 - 47-48 - 49-50 - 51-52 - 53-54 - 55-56 - 57-58 - 59-60 - 61-62 - 63-64 - 65-66 - 67-68 - 69-70 - 71-72 - 73-74 - 75-76 - 77-78 - 79-80 - 81-82 - 83-84 - 85-86 - 87-88 - 89-90 - 91-92 - 93-94 - 95-96 - 97-98 - 99-100 - 101-102 - 103-104 - 105-106 - 107-108 - 109-110 - 111-112 - 113-114 - 115-116 - 117-118 - 119-120 - 121-122 - 123-124 - 125-126 - 127-128 - 129-130 - 131-132 - 133-134 - 135-136 - 137-138 - 139-140 - 141-142 - 143-144 - 145-146 - 147-148 - 149-150 - 151-152 - 153-154 - 155-156 - 157-158 - 159-160 - 161-162 - 163-164 - 165-166 - 167-168 - 169-170 - 171-172 - 173-174 - 175-176 - 177-178 - 179-180 - 181-182 - 183-184 - 185-186 - 187-188 - 189-190 - 191-192 - 193-194 - 195-196 - 197-198 - 199-200 - 201-202 - 203-204 - 205-206 - 207-208 - 209-210 - 211-212 - 213-214 - 215-216 - 217-218 - 219-220 - 221-222 - 223-224 - 225-226 - 227-228 - 229-230 - 231-232 - 233-234 - 235-236 - 237-238 - 239-240 - 241-242 - 243-244 - 245-246 - 247-248 - 249-250 - 251-252 - 253-254 - 255-256 - 257-258 - 259-260 - 261-262 - 263-264 - 265-266 - 267-268 - 269-270 - 271-272 - 273-274 - 275-276 - 277-278 - 279-280 - 281-282 - 283-284 - 285-286 - 287-288 - 289-290 - 291-292 - 293-294 - 295-296 - 297-298 - 299-300 - 301-302 - 303-304 - 305-306 - 307-308 - 309-310 - 311-312 - 313-314 - 315-316 - 317-318 - 319-320 - 321-322 - 323-324 - 325-326 - 327-328 - 329-330 - 331-332 - 333-334 - 335-336 - 337-338 - 339-340 - 341-342 - 343-344 - 345-346 - 347-348 - 349-350 - 351-352 - 353-354 - 355-356 - 357-358 - 359-360 - 361-362 - 363-364 - 365-366 - 367-368 - 369-370 - 371-372 - 373-374 - 375-376 - 377-378 - 379-380 - 381-382 - 383-384 - 385-386 - 387-388 - 389-390 - 391-392 - 393-394 - 395-396 - 397-398 - 399-400 - 401-402 - 403-404 - 405-406 - 407-408 - 409-410 - 411-412 - 413-414 - 415-416 - 417-418 - 419-420 - 421-422 - 423-424 - 425-426 - 427-428 - 429-430 - 431-432 - 433-434 - 435-436 - 437-438 - 439-440 - 441-442 - 443-444 - 445-446 - 447-448 - 449-450 - 451-452 - 453-454 - 455-456 - 457-458 - 459-460 - 461-462 - 463-464 - 465-466 - 467-468 - 469-470 - 471-472 - 473-474 - 475-476 - 477-478 - 479-480 - 481-482 - 483-484 - 485-486 - 487-488 - 489-490 - 491-492 - 493-494 - 495-496 - 497-498 - 499-500 - 501-502 - 503-504 - 505-506 - 507-508 - 509-510 - 511-512 - 513-514 - 515-516 - 517-518 - 519-520 - 521-522 - 523-524 - 525-526 - 527-528 - 529-530 - 531-532 - 533-534 - 535-536 - 537-538 - 539-540 - 541-542 - 543-544 - 545-546 - 547-548 - 549-550 - 551-552 - 553-554 - 555-556 - 557-558 - 559-560 - 561-562 - 563-564 - 565-566 - 567-568 - 569-570 - 571-572 - 573-574 - 575-576 - 577-578 - 579-580 - 581-582 - 583-584 - 585-586 - 587-588 - 589-590 - 591-592 - 593-594 - 595-596 - 597-598 - 599-600 - 601-602 - 603-604 - 605-606 - 607-608 - 609-610 - 611-612 - 613-614 - 615-616 - 617-618 - 619-620 - 621-622 - 623-624 - 625-626 - 627-628 - 629-630 - 631-632 - 633-634 - 635-636 - 637-638 - 639-640 - 641-642 - 643-644 - 645-646 - 647-648 - 649-650 - 651-652 - 653-654 - 655-656 - 657-658 - 659-660 - 661-662 - 663-664 - 665-666 - 667-668 - 669-670 - 671-672 - 673-674 - 675-676 - 677-678 - 679-680 - 681-682 - 683-684 - 685-686 - 687-688 - 689-690 - 691-692 - 693-694 - 695-696 - 697-698 - 699-700 - 701-702 - 703-704 - 705-706 - 707-708 - 709-710 - 711-712 - 713-714 - 715-716 - 717-718 - 719-720 - 721-722 - 723-724 - 725-726 - 727-728 - 729-730 - 731-732 - 733-734 - 735-736 - 737-738 - 739-740 - 741-742 - 743-744 - 745-746 - 747-748 - 749-750 - 751-752 - 753-754 - 755-756 - 757-758 - 759-760 - 761-762 - 763-764 - 765-766 - 767-768 - 769-770 - 771-772 - 773-774 - 775-776 - 777-778 - 779-780 - 781-782 - 783-784 - 785-786 - 787-788 - 789-790 - 791-792 - 793-794 - 795-796 - 797-798 - 799-800 - 801-802 - 803-804 - 805-806 - 807-808 - 809-810 - 811-812 - 813-814 - 815-816 - 817-818 - 819-820 - 821-822 - 823-824 - 825-826 - 827-828 - 829-830 - 831-832 - 833-834 - 835-836 - 837-838 - 839-840 - 841-842 - 843-844 - 845-846 - 847-848 - 849-850 - 851-852 - 853-854 - 855-856 - 857-858 - 859-860 - 861-862 - 863-864 - 865-866 - 867-868 - 869-870 - 871-872 - 873-874 - 875-876 - 877-878 - 879-880 - 881-882 - 883-884 - 885-886 - 887-888 - 889-890 - 891-892 - 893-894 - 895-896 - 897-898 - 899-900 - 901-902 - 903-904 - 905-906 - 907-908 - 909-910 - 911-912 - 913-914 - 915-916 - 917-918 - 919-920 - 921-922 - 923-924 - 925-926 - 927-928 - 929-930 - 931-932 - 933-934 - 935-936 - 937-938 - 939-940 - 941-942 - 943-944 - 945-946 - 947-948 - 949-950 - 951-952 - 953-954 - 955-956 - 957-958 - 959-960 - 961-962 - 963-964 - 965-966 - 967-968 - 969-970 - 971-972 - 973-974 - 975-976 - 977-978 - 979-980 - 981-982 - 983-984 - 985-986 - 987-988 - 989-990 - 991-992 - 993-994 - 995-996 - 997-998 - 999-1000

پھوپھو کو گلے لگایا۔ منہ بیٹھا کر آیا اور قریب کھڑی
 کینڈی کی انگلی میں اپنی انگوٹھی ڈال دی۔ تمام لوگوں
 نے عہس کو کانٹھوں پر اٹھا کر وہ شور مچایا کہ فوزیہ
 پھوپھو کھسائی سی بس دیکھتی رہ گئیں۔
 اس وقت ان کا دل کر رہا تھا کہ خالص دہی انداز
 میں بیچ مکن کے پھسکڑا مار کر بیٹھیں اور اونچا اونچا
 روئیں۔ وہ ایسا کر بھی گزر گئیں جو کینڈی کی کھاتی
 صورت پر نگہ نہ جا پڑتی۔ کسی گلاب سی ہو رہی تھی وہ،
 ایسا رد عمل تو انہوں نے تب بھی نہ دیکھا تھا جب
 زارون کے بارے میں رائے لی تھی۔ تب تو یک دم
 چپ سی ہو گئی تھی وہ! بس۔۔۔ فیصلہ ہو گیا تھا۔ ان کی
 کینڈی کے لیے عہس ہی بہترین تھا۔ وہ مل گئیں،
 اپنی انا کا جھنڈا اونچا رکھنے کے لیے بیٹی کی زندگی سے
 انتقام کیل لیتیں بھلا! اگلے کچھ ہی پولوں میں فوزیہ
 پھوپھو عہس کے واری صدفے جاری تھیں۔
 زندگی میں رشتوں کی جگہ کبھی مختصر نہیں ہوتی بلکہ
 دلوں میں کج باش کم بڑ جاتی ہے۔ اور جب دلوں میں
 جگہ نہ رہے تو حلق پھٹنے کے سنگروں کی مانند زندگی
 سے خارج ہو جاتے ہیں!

بے جی اور میاں جی۔۔۔ اجمل صاحب اور بیگم
 اجمل کے ساتھ جا کر زارون کی پسند کو اوسے کر آئے
 تھے۔ بیگم اجمل کے دل سے سارا حلق جاتا رہا تھا
 کشمکش عرف ککھی کود کچھ کر۔۔۔ وہ کینڈی جیسی نہیں
 تھی بلکہ کینڈی سے بھی زیادہ پیاری اور معصوم
 صورت تھی!

ان لوگوں نے بھی بے حد آؤ بھگت کی تھی۔۔۔
 گھر نہ کھانا چاہتا تھا بے حد سویر بھی تھا۔ میاں جی
 نے زارون کے وہ بارہ پاکستان آنے پر شادی طے کی
 تھی! زارون کو پتا چلا تو بیچ مکن میں عہس اور
 اور پس بھائی کے ہمراہ بیگم کے ڈالے تھے۔ ساتھ
 میں گونگو بھی گول گول گھوسے جا رہا تھا۔ اور اسی
 گھونٹے میں تین دفعہ ہٹ کے گرا تھا۔

بے جی کے پلنگ پر ان کے ساتھ بڑی پیار محبت
 سے بیٹھے میاں جی کی آنکھیں یہ منظر دیکھ کر جھپٹا
 گئیں۔ یہ سوچ ہی انہیں کند چھری سے سز ع کیے جوتی
 تھی کہ اگر ان کا یا ر ناراضی کی حالت میں ہی انہیں
 چھوڑ کر چل دیتا تو؟ آج جوان کے گھر کے کونے کونے
 سے خوشیوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے اس کی ایک
 بڑی وجہ دونوں گھرانوں کے مابین تعلقات کی بحالی تھی۔
 بیٹا وقت تو کوئی لوٹا نہیں سکتا مگر گزرتے وقت کو پا
 ضرور سکتا ہے۔

کینڈی اور ٹوبہ بھابی کے برزور اصرار پر حرم کی
 شادی کے سلسلے میں گھر میں ڈھولک رکھی جا چکی تھی۔
 ٹوبہ بھابی کے تو رنگ ڈھنگ ہی آج کل جدا تھے۔
 مکتی طرزی زندگی جیتے اور پس بھائی کو بھی گلے لگا
 تھا کہ ان کی اور ٹوبہ بھابی کی شادی کی گاڑی کو اگر
 بروقت محبت و الفت کا پیڑ پھول نہ ملا تو کبھی بھی انجن کے
 کل پرزے رنگ آلود ہو کر جام ہو سکتے تھے۔ لہذا آج
 کل ملنا تھا اور پس بھائی، ٹوبہ بھابی کے لیے موقع
 کے نکلن پکڑ لاتے تھے۔ تو کبھی چپکے سے کسی اوٹ
 میں بیٹھاپان کھلاتے دکھائی دیتے۔ اور تو اور رات کو
 بچوں کو سلا کر خود کالونی کے چکر کاٹنے نکل جاتے۔
 اس صورت حال نے ہوتی سی ٹوبہ بھابی میں بے حد
 اعتکوپ پیدا کیا تھا۔ سارا دن بچوں کے ساتھ گلابی اردو
 میں لعن طعن کرنے والی اور ہر ایک کا حکم نہما ہونٹوں
 سے سن کر۔۔۔ آنکھیں پٹھٹا کر۔۔۔ بجا آوری کر لینے والی
 ٹوبہ بھابی آج کل ہرگز بھی گاؤدی نہیں لگتی تھیں
 بلکہ وہ بڑے ملن اور اعتکوپ کے ساتھ ہر معاملے میں
 بہترین مشورہ دیتی دکھائی دیتیں! اعتبار وہ آب حیات
 ہے جسے پی کر محبت کو کبھی موت نہیں آتی۔
 اور سر شام ہی کالونی سے حرم کی اسٹوڈنٹس اور
 سہیلیاں آن پکھتیں۔ پھر تو وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر، ہنر
 آڑاے جاتے کہ بس ڈھولک پھاڑنے کی کسر رہ جاتی
 لگے ہاتھوں بے جی، زینب بی کو بھی اوھر ہی بلا

ہے۔“ وہ ذرا سا جھجکتے ہوئے مدھے پر آیا۔
 ”دیکھ! میں صوفی کی بریائی کے دوڑوں اور جن کی
 آئیں کریم سے کم ہرگز، ہرگز نہیں ماننے والا۔
 بتائے دے رہا ہوں!“ عمیس نے اپنے گال پر بیٹھے
 مچھر کو چمٹا کر گال سے چمٹایا۔
 ”تیری اوقات اتنی ہی ہے غیث۔! واپسی پر تجھے
 درجن مجھے بھی لے دوں گا جن کے ساتھ دو دو روپے
 والے کھلونے بندھے ہوتے ہیں۔ اب خوش۔! اپنی
 الحال حرم کو منانے میں تو شرافت سے میری مدد کر۔“

”میں بے چارہ کیا مدد کروں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر
 سکتا ہوں کہ تجھے زنانہ جوڑا بھیج دتا ہوں۔ پن کر آجا
 اور ذرا ڈھولک سنبھال لے آکر۔ دو چار سریلے ہاتھ
 جھاڑے یار! ورنہ یہ لڑکیاں تو محض گلے پھاڑ رہی ہیں،
 قسم لے لے۔“
 ”اب اگر تو نے ایک بھی لفظ بے کار میں پھونٹا تو
 میں تیرا سر بھاڑ دوں گا اور پھر کینڈی یقیناً“ تیرے جیسے
 بچے کنستہ سے شادی نہیں کرے گی۔“
 ”یہ تو بار بار مجھے کینڈی کی دھمکی کیوں دے رہا جاتا
 ہے۔ اچھا بول کیا کروں۔؟“ اب کے عمیس
 شرافت سے مانا تھا۔ اس سے زیادہ احرار کو تنگ
 کرنا تو اس سے کوئی بعید نہ تھا، ہم میں آکر اس کی گردن
 دبوچ لیتا۔

”چھت پر پہنچو۔ میں بھی آ رہا ہوں۔!“
 مختصر کہہ کر احرار نے کل منقطع کردی تھی۔
 دو دفعہ عمیس کی اوئے۔ اوئے بھی سنی تھی مگر
 اس وقت اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ اسے حرم
 کا دل صاف کرنا تھا۔



چودھویں کے چاند پہ نگاہیں جمائے اس کی ذہنی رو
 بھٹکی ہوئی تھی۔ اس نے ملک تک نہیں جھپکی تھی۔
 چرے۔ اداسی رمل تھی جس نے اس کے حسن کو
 چودھویں کے چاند سی جلا جیسی تھی۔ موتیا رنگ کی

لیتیں۔ دونوں پلنگ پر بیٹھی سر جوڑے سب کو دیکھ
 دیکھ رہے جانتیں اور رخ موڑ کر چادر کے پلو سے
 آنکھوں کے نیچے کوئے بھی رگڑ دیتیں۔!
 احرار نے بہتری کو ششیں کر ڈالی تھیں کہ کسی
 طرح اسے بھی اجازت مل جائے کہ وہ کم از کم صحن
 تک ہی آجایا کرے۔ مگر مہیاں جی کے ہوتے یہ بھلا
 کب ممکن تھا۔ بس بالکونی میں کھڑا دیوار پار کے
 حسین مناظر دیکھا کرتا۔ نگاہیں حرم کو کھوجتی رہتیں
 مگر وہ ایسی غائب ہوئی تھی کہ بھولے سے بھی نہیں
 دکھائی دے رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے
 کے ٹیرس پہ ریٹنگ سے کنہیاں نکائے دیوار پار صحن
 میں زور زور سے ڈھولک بجاتی ایک طرح دار حینہ
 کے حسین چرے میں حرم کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش
 کر رہا تھا۔ جب یکایک ایک خیال نے اسے چونکایا
 ۔۔۔ جینز کی جیب سے موبائل نکالا اور نمبر ڈائل کر کے
 کان سے لگایا۔ کافی دیر کے بعد عمیس نے کل
 اینڈ کی اور جب اینڈ کر لی تو بڑے بے صبر انداز
 میں پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ ہلو۔ کون بول رہا ہے۔۔۔؟“
 ”تیرا بہنوئی۔!“ احرار کا جواب بھی اٹھ مار تھا۔
 ”اوہ۔۔۔ اور میری اپنے بہنوئی سے نہیں بنتی۔!“
 وہ دوسرے کان میں انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔
 ”دیکو اس بند کر۔ اور یہ بتا کہ کیا کر رہا ہے؟“ احرار
 نے چکر پوچھا۔

”بس جانی! قدرت کے اسرار کھوج رہا ہوں۔!“
 وہ اس وقت پن کی لاشٹ آف کر کے جالی والے
 دروازے سے ناک نکال کر ہر بیٹھی لڑکیاں تاڑ رہا تھا۔
 ”اچھا۔۔۔ بس یہی بتا کرنے کا کہا تھا کینڈی نے۔۔۔
 رکھتا ہوں اب۔۔۔ ذرا اسے کل کر لوں۔!“

”اوئے۔۔۔ اوئے۔۔۔ پاگل ہوا ہے کیا۔۔۔ کیوں
 کنارے پر ہی میری کشتی ڈبونا چاہتا ہے۔ بول کیا کام
 ہے۔؟“ عمیس ج میں بوکھلا کر بولا۔

”ہاں۔۔۔! یہ ہوئی نا بات۔ ہزار بار بولا ہے قیص
 کے ٹن میں رہا کہ اچھا وہ ایسا ہے کہ۔۔۔ مجھے منانا

دنیا کو تباہ کر دوں یا خود کو فنا کر لوں۔۔۔ میرا رشتوں سے،
جذیوں سے۔۔۔ محبت سے، ہر چیز سے اعتبار اٹھ گیا
تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ساری دنیا محض ایک ہی
تعلق کے زیر اثر ہے اور وہ ہے غرض کا تعلق۔ اس
کے علاوہ باقی سب جھوٹ ہے، بھوکا ہے۔ میں کیا
کرتا حرم۔۔۔ کس کے پاس جاتا۔ مجھے ان دنوں کوئی
بھی اپنا نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ مجھے میرے اپنوں سے
ہی بدگمان کیا گیا تھا۔ میں اپنی کمزوری مانتا ہوں حرم!
لیکن خدا را میری محبت کی سچائی پہ شک مت کرو،
میں کل بھی تم سے۔۔۔

”آہم۔۔۔ آہم۔۔۔! مونگ پھلی کا دانہ ہوا میں
اجھال کر منہ کھول کر بیچ کرتے ہوئے۔۔۔ زور سے گلا
صاف کر کے عمیس نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا
۔۔۔ حرم جو پلکیں موندے، دم سادھے بے خود سی احزار
کو سننے جا رہی تھی۔ سٹپا گئی۔۔۔ غیر محسوس انداز میں
آنکھوں میں اتری نمی کو چھٹکی کی پور سے پونچھ کر
گردن میں تباؤ پیدا کیا۔ اور اتر کر بولی۔
”عمیس۔۔۔ انواب صاحب سے کہو کہ ہمیں ان
کی کسی بات پر یقین نہیں۔ لفاظی سے کام نہ لیں۔“

”ابن کا بہن بول رہے لاکہ چل پھٹ لے یاں
سے۔۔۔ کٹھی ہو شہاں۔۔۔! عمیس نے کالر کھڑے
کر کے دادا گیری اشائل میں حرم کا جواب پہنچایا مگر
اس سے پہلے وہ دوبار سے اتر کر احزار کی زد سے دور ہوتا
نہیں بھولا تھا۔ حرم کو اس جواب پہ غضب کی ہنسی
آئی مگر دبا گئی جبکہ احزار دانت کچکاتے ہوئے بولا۔
”اس نے یہ نہیں کہا۔ تم اپنا منہ بند رکھو ورنہ
بتی توڑ دوں گا۔“ پھر وہ حرم سے مخاطب ہوا۔
”حرم! میں کوئی لفاظی نہیں کر رہا۔ یہ میرے اندر کی
سچائی ہے جو زبان سے بیان کی ہے۔ اگر تمہیں میری
بات کا یقین نہیں تو۔۔۔ تو میں۔۔۔!“

اسے آگے کوئی لفظ نہیں سوجھ رہا تھا۔ چہرے پر
بے چارگی چھائی تھی۔ عمیس اسے بڑی کمبختی
مسکراہٹ سے دیکھتا بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔

شال نے اس کے سرخ و سپید عارضوں سے مس ہو کر
گویا بالہ سا بنا رکھا تھا۔۔۔ اگھر اس کی صورت پر بے
زاری اور آکٹاہٹ تھی۔ اس کا دل اچاٹ تھا۔
عمیس زبردستی اسے پھٹ پر لے کر آیا تھا کہ چل کر
تھوڑی دیر تازہ ہوا میں سانس لے۔ ساری کلفت
دور ہو جائے گی۔ لیکن اوپر سردی اس قدر تھی کہ
ہڈیوں کا گواہنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے نکلتا تے
دانتوں کو بھینچ کر ایک نظر یاریک سا دھندلا غلاف
لوڑھے چاند کو دیکھا اور دوسری نظر عمیس پر ڈالی جو
مزے سے دونوں گھروں کی مشترکہ دیوار پر چڑھ کر بیٹھا
جیب سے چھٹی ہوئی مونگ پھلی نکال نکال کر ٹوٹے جا
رہا تھا۔

اس نے تپ کر اسے دیکھا اور بازو پر دھپ مارتے
ہوئے بولی۔
”یہ تم میری طبیعت فریش کرنے کے لیے اوپر
لائے ہو یا فریز کرنے کے لیے۔ میری ہڈیاں کو کڑوا
رہی ہیں اور تم مزے سے منہ چلائے جا رہے ہو۔!“
اس پر رتی بھر اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی تسلسل سے
مونگ پھلی ٹوٹے جھرا تھا۔ حرم زچ ہو گئی۔
”عمیس۔۔۔ میرا دل غ خراب مت کرو مزید۔
میں جا رہی ہوں نیچے۔“

”آہم۔۔۔! اس کے قریب ہی نیکدم کسی کے گلا
کھنکھارنے کی آواز ابھری۔۔۔ وہ کھیرا کے پٹی۔
احزار کو دیکھ کر اس کی تیریاں چڑھ گئیں۔
”عمیس۔۔۔! تم انتہائی کہنے ہوئے مجھے تم سے یہ
امید نہیں تھی جا رہی ہوں میں نیچے۔! وہ عمیس
کو گھر کتے ہوئے بولی اور واپسی کے لیے مڑنے ہی لگی
تھی جب پیچھے سے احزار نے بڑی محبت سے اس کا نام
پکارا تھا۔

”حرم۔۔۔! اس نے اذیت کے احساس سے
مغلوب ہو کر آنکھیں میچ لیں مگر خاموش رہی۔

”حرم! پلے، میری بات سننے بغیر مت جانا۔ میں
مانتا ہوں میرا قصور ہے۔ مگر یقین مانو، مجھے اس بری
طرح سے الجھایا گیا تھا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ میں ساری

”عمیس! نواب صاحب سے کہو۔ ہمیں کسی صفائی کی حاجت نہیں۔ اب جو بات ہوگی، دوبارہ ہوگی۔ ذرا یہ بھی انتظار کا مزہ کشید کریں۔“

”ابن کا بن بول رہے لاکہ اسے کس کام والی ہائی (صفائی والی) کا ضرورت نہیں رہے۔ ہاں۔ تیرے کو کام کرنا اگلتا تو، تو آکر ہماری میچ (بھینس) کی کھد مت کر دیا کر رہے۔ پھوکت میں!“ حرم نے فوراً شل کالیو منہ پہ دھرا۔ اس سے ہنسی روکنا بے حد دشوار ہو گیا تھا۔ وہ اس نے رخ موڑ رکھا تھا ورنہ احرار کا چہرہ دیکھ لیتی تو لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ اس نے عمیس کو دوبارہ بک بک کرتے سنا جو نجانے کب کے بدلے رہا تھا۔

”اب اور (دوہ) گائے کو کھڑا رہے۔ چل شہباز، تیلی علی سے نکل لے۔ چھپو رہے۔“

”تیری تو۔“ احرار کی برداشت اسی قدر تھی۔

لولی خون تھا۔ ایک جست میں دیوار پھلانگ کر لوہر تھا اور اگلے ہی لمبے عمیس کی گردن اس کے مضبوط ہانڈے کے قلعے میں تھی۔ عمیس کو ٹھکنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ حرم اس کی درگت پر اب کل کر رہے جا رہی تھی۔ احرار ایک ٹک اسے تنے جا رہا تھا اور اس کے ہانڈے میں چھنا عمیس حرم کی طوطا چشمی اور دوست کی ندراری کی پہلی دلیے جا رہا تھا۔

احرار اور حرم کی نظریں ملیں۔ اور یقین کی شع پوری آب و تاب سے جل اٹھی۔ دل کے ناموں نے جلتے ٹک سا بجلیا اور محبت نے مرثیت کی۔ وہ اک دو جے کے لیے تھے اور ہمیشہ کے لیے تھے! حرم شریکیں مسکراہٹ لیے احرار کی وارفتہ نظروں سے راسن بجاتی نیچے بھاگی۔ پیچھے عمیس اور احرار نوراً کشتی غمے لیے بالکل تیار تھے! چودھویں کا چاند مزید روشن ہو گیا تھا۔

آتے پورے چاند کو تک رہے تھے۔ انہیں آج بھی پورے چاند کی رات اتنی ہی بھاتی تھی جتنی اس وقت جب پچھلے دلالان میں حوروں جیسی پائیزہ اور حسین عانکہ بیٹھی بے خودی کے عالم میں چودھویں کا چاند نہارا کرتی تھیں اور وہ اتنی ہی مست ہوئے خود سے اپنی بالکونی سے انہیں دیکھ دیکھ سیر ہوا کرتے۔

ان کی محبت ان کا زور لہ بھی۔ ان کی متاع حیات، لور عانکہ سے تو انہوں نے عشق کیا تھا۔ لور یہ عشق لا حاصل نہیں تھا۔ یہ عشق ان کی مدح میں سرایت کر چکا تھا۔ اسے دوام حاصل تھا۔ لور کی ان کی زیست کا حاصل تھا۔ اچل صاحب ایک جذب کی کیفیت میں اپنی جگہ سے اٹھے اور کھڑکی کے پاس آگن کھڑے ہوئے۔ انہیں اپنے ارد گرد الوہی سی محک محسوس ہونا شروع ہوئی۔ ان کے عشق کی آگ جب لودیتی تو خوشبو کی پٹیں رقص کیا کرتیں! وہ آج بھی ماضی میں جیتے تھے۔ حال تو بس جھپٹتے تھے۔

وہ وقت بہت کڑا تھا جب نواب حسین احمد خان نے تمام موت ہلائے طلق رکھے ہوئے عانکہ کے لیے بھیجے گئے ان کے رشتے سے انکار کیا تھا۔ انہیں ہرگز ایسی امید نہ تھی۔ وہ جو عانکہ کے ساتھ خوشبو بھری باتیں کیا کرتے تھے۔ تیلیوں کے رکھوں کو چٹا کرتے تھے اور مستقبل کے سنہری جگنو مٹیوں میں بھرا کرتے تھے۔ جیسے ایک جھکے سے منہ کے بل

نشن پر آ رہے۔

دلوں میں رنجشیں نمودار گئیں اور تعلقات کے بیزارے ہو گئے۔ وہ اپنے غم کو دل میں دبائے لذت ناک حد تک تھمائی پسند ہو گئے۔ ماں باپ نے ایک رسائی اور واجبی سے بھی کم پڑھی لکھی لڑکی سے نصیب ہانڈہ دے۔ انہیں چنداں پروا نہ ہوئی۔ وہ چاہتے بھی یہی تھے کہ اگر عانکہ نہیں تو پھر کوئی ایسی جو فوق دلیری سے ٹا اٹھا ہو۔ جس کو ان کی ذات کی پرتوں تلے جیسے نار سائی کے غم سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ اور یکدم جمال ہو ہو ایسی ہی تھیں۔ اور پھر جب جدائی کا نشہ سرور بن کر گردنوں میں دوڑنے لگا تو عانکہ کے مرے

”اب اور (دوہ) گائے کو کھڑا رہے۔ چل شہباز، تیلی علی سے نکل لے۔ چھپو رہے۔“

”تیری تو۔“ احرار کی برداشت اسی قدر تھی۔

لولی خون تھا۔ ایک جست میں دیوار پھلانگ کر لوہر تھا اور اگلے ہی لمبے عمیس کی گردن اس کے مضبوط ہانڈے کے قلعے میں تھی۔ عمیس کو ٹھکنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ حرم اس کی درگت پر اب کل کر رہے جا رہی تھی۔ احرار ایک ٹک اسے تنے جا رہا تھا اور اس کے ہانڈے میں چھنا عمیس حرم کی طوطا چشمی اور دوست کی ندراری کی پہلی دلیے جا رہا تھا۔

احرار اور حرم کی نظریں ملیں۔ اور یقین کی شع پوری آب و تاب سے جل اٹھی۔ دل کے ناموں نے جلتے ٹک سا بجلیا اور محبت نے مرثیت کی۔ وہ اک دو جے کے لیے تھے اور ہمیشہ کے لیے تھے! حرم شریکیں مسکراہٹ لیے احرار کی وارفتہ نظروں سے راسن بجاتی نیچے بھاگی۔ پیچھے عمیس اور احرار نوراً کشتی غمے لیے بالکل تیار تھے! چودھویں کا چاند مزید روشن ہو گیا تھا۔



چھوٹی سی اسٹڈی میں رائگ چیریر بیٹھے وہ بہت آہستگی سے جھولتے ہوئے مسلسل کھڑکی سے نظر

کی خبر آگئی۔ سب سرور، زہر نگل گیا۔ وہ ہار ہار کے ٹوٹے اور ٹوٹ ٹوٹ کے ہارے۔ عشق ملیک بن کر ان کے اندر بیٹھ گیا جو غمبار میں دیوانہ وار رقص جاری رکھتا اور دھڑکنے زخم زخم ہوتی رہتے! کتنی ہی زندگی بچوے کی مانند سک سک کر گزر گئی۔ اور پھر ایک اتفاق نے انہیں نواب حسین احمد خان کے سامنے لا کھڑا کیا۔ دونوں ہی اک دو بے کو دیکھے چلے گئے اور دل نے دل سے دلوں کی بات کہہ دی۔ دونوں کے دکھ ملتے تھے۔ دونوں کو ایک ہی وجود سے بے پایاں محبت تھی مگر نوعیت مختلف تھی۔ دونوں کو ایسی محبت نے جوڑ دیا۔ ایک کے انداز میں شرمندگی تھی (انکار کی) تو دوسرے کے انداز میں دلجوئی تھی۔ یوں ایک دوسرے کا مرہم بن کر دونوں نے زندگی کرنے کا سلن پیدا کیا۔ بیٹھک ج گئی۔ شطرنج کی بسلطہ بچھ گئی۔ مہلوں نے اپنی اپنی مکمل سنبھالی تو چالیں چلنے کا لطف آنے لگا۔ مہلوں کو پٹنے سے بچاتے بچاتے بات رشتوں کو پٹنے سے بچاتے پر آئی تو جمل صاحب نے زندگی کا سب سے بڑا داؤ کھیلا۔ احرار ان کو عزم تھا، اتنا کہ ان کے پاس بیانہ نہیں تھا جس سے وہ اس الفت کو بچے جو انہیں احرار سے تھی۔ وہ عائشہ کی اولاد بنے بس کی اول آخر تھا!

وہ کیسے اسے خود کی بھی نگاہوں سے دور ہونے دیتے جس کے چہرے کے نقش نقش میں عائشہ بولتی تھیں۔ جس کی آواز میں عائشہ گنگنائی تھیں۔ جس کی چال میں ویسا ہی ٹھہراؤ تھا اور جس کے وجود نے عائشہ کا لمس چرایا تھا!

وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی یہ چال کامیاب ہوگی یا نہیں کیونکہ وہ کھلاڑی نہ تھے۔ انہیں تو شطرنج سے بھی رغبت محض نواب صاحب کی خاطر تھی۔ مگر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے تاکہ کھلاڑی بے سوچے سمجھے ایسا داؤ کھیل جاتا ہے جو بس آریا بار کے چکر میں کھیلے جاتے ہیں۔ بالکل یہی کام جمل صاحب نے کیا تھا۔ جمل صاحب نے بھی اندھیرے میں تیر چلایا جو ٹھیک نشانے لگا۔ بصورت دیگر وہ سب احرار کو، بیشہ بیشہ کے لیے ٹھوہرتے۔

اس استغراق میں ایک عمر تمام ہوئی تھی۔ ایک لمبا عرصہ تھا جو انہوں نے وقت کے لمبے سے بچ کر تیا تھا۔ اب کچھ ہی وقت جاتا تھا جب یہ موج کنارے پہ آن ٹھہرتی!

ستو بے خود سے وہ ملن کا ہنڈولا جھول رہے تھے۔ کچھ کہہ رہے تھے تو کچھ سن رہے تھے۔ جب ہلکی سی ٹھہر تھابت ان کے پلو سے ابھری اور وہ بری طرح چونکے۔ ان کے سیلر نواب صاحب کا مہیج تھا۔ اپنی بیٹھک میں شطرنج کی بسلطہ بچھائے بیٹھے تھے اور ان کے شکر تھے! جمل صاحب پیغام پڑھ کر آزرہ سے مسکرا کر اٹھے اور کھڑے ہو گئے۔

”اے زندگی! تو نے ہمیں کیوں نہ اسخان میں ڈالا! دھیسے سے بڑھو اتے انہوں نے اجازت طلب نظروں سے روشنی میں ملفوف نازک بیولے کو دیکھا۔ کھڑکی پر پڑے رہی بڑے کی سربراہی کے ساتھ ہی ایک خفیف سا خوشبو کا جھونکا ان کے وجود سے بکرایا۔ گویا جانے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ وہ بھرپور مسکرا دیے اور سر کو ذرا سا ٹھم کرتے عقیدت سے موجزن دل لیے باہر کو چلی دیے۔

آج کی بازی نواب صاحب کے نام تھی۔ کیونکہ اب انہیں ہارجیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اپنے حصے کی بازی کھیل آئے تھے۔ اب ان کی بلا سے جو بھی ہو کیونکہ عرصہ ہوا ان کی زندگی کی بسلطہ کے تمام مہرے قسمت کے ہاتھوں پٹ چکے تھے۔ کھیل تمام شد!